خدا پر ایمان

دنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں ملتا ہے لیکن اس کے باوجود قرآن
ان کے اس ایمان کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ اس لئے
کہ
ان کے ہاں خدا کا صحیح تصوّر نہیں

خدا کا صحیح تصوّر

خدا ہی کے ہاں سے مل سکتا ہے یعنی قرآن مجید سے۔ خدا کا یہی وہ تصوّر ہے
جسے پرویز صاحبؒ نے اپنی معرکہ آرا کتاب

من و یزداں

میں نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ نیز یہ بھی بتایا ہے کہ ہم خدا پر کیوں ایمان لاتے
ہیں اور انسان اور خدا کا تعلق کیا ہے۔ یہ بڑی پر از حقائق کتاب ہے۔

بڑا سائز ضخامت ۴۰۶ صفحات۔ کاغذ اعلیٰ، جلد مضبوط مزیّن اور مطلّا
قیمت فی جلد ۷۵/- روپے علاوہ محصول ڈاک

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)، ۲۵-بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور

یتیم پوتے کی وراثت

یوں تو قرآن کریم کی تعلیم کا کونسا گوشہ ہے جس کی اعجازی کیفیت سے چشم بصیرت محو حیرت نہیں رہ جاتی۔ (اس کا تو ایک ایک لفظ بے مثل و بے نظیر ہے) لیکن بعض احکام کی جامعیت ایسی ہے جس پر غور و فکر سے روح وجد میں آجاتی ہے۔ انہی احکام میں قرآن کا قانونِ وراثت بھی ہے۔ قرآن نے اپنی چار مختصر سی آیات میں اتنا اہم اور وسیع قانون اس انداز سے اصولی طور پر سمیٹ کر رکھ دیا ہے کہ اس کی جامعیت اور ایجاز پر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن ہماری بدبختی ملاحظہ ہو کہ یہی قانونِ وراثت جب ملّا کے ہتے چڑھ گیا تو نہ صرف یہ کہ یہ قانون دنیا کا مشکل ترین مسئلہ بن گیا بلکہ اس کی بعض شقیں ایسی مضحکہ انگیز شکلیں اختیار کر گئیں کہ انہیں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ انہی گوشوں میں ایک مسئلہ یتیم پوتے کی وراثت کا ہے چونکہ یہ مسئلہ (قانونی مسائل کی طرح) فنی ہے اس لئے اسے ذرا غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس کی فنی اصطلاحات سے صرفِ نظر کر کے اسے عام فہم الفاظ میں سمجھایا جائے۔ ذرا ذیل کے نقشے کو سامنے رکھئے

زید

(زید کا بیٹا) بکر — عمر (زید کا بیٹا)

(بکر کا بیٹا) حامد — رشید (عمر کا بیٹا)

زید کی زندگی میں بکر فوت ہو گیا۔ اس کے بعد زید وفات پا گیا۔ زید کی وفات کے وقت اس کا بیٹا عمر بھی زندہ ہے۔ (اور رشید بھی) اور اس کے ساتھ اس کا یتیم پوتا (حامد) بھی۔ ملّا کا مذہب ہے کہ زید کی ساری جائداد عمر کے حصے میں آگئی۔ حامد کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس کا قصور؟ یہی کہ وہ یتیم ہے۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں، اسے وراثت سے کیوں نہ محروم کیا جائے؟

مرے کو مارے شاہ مدار

ایسے ہی مواقع کے لئے کہا گیا ہے۔

ہم نے اس سے پیشتر ایک مرتبہ مختصراً اس مسئلے کے متعلق طلوعِ اسلام (کے باب المراسلات) میں لکھا تھا۔ لیکن چونکہ اب یہ مسئلہ ملک کا قانون بن گیا ہے، اس لئے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھا جائے۔ پہلے ان دلائل کو لیا جائے جو اس کی محرومی کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس مضمون کو چھاپ دیا جائے جو اس سے قبل طلوعِ اسلام میں لکھا جا چکا ہے اور پھر علامہ اسلم جیراجپوری کا مقالہ "محجوب الارث" شائع کر دیا جائے۔ موخر الذکر مقالہ آجکل نایاب ہو چکا تھا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک دوست نے . . . ہم پہنچایا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس طرح ایک اہم تحقیقی مضمون

طلوعِ اسلام کے دفتین میں محفوظ ہو جائے گا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالك۔

اب آیئے ان دلائل کی طرف۔ رسالہ ترجمان القرآن (بابت مارچ ۱۹۵۳ء) میں حسبِ ذیل سوال اور اس کا جواب شائع ہوا ہے۔

سوال۔ دادا کی زندگی میں اگر کسی کا باپ مرجائے تو پوتے کو وراثت میں سے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ مشہور شرعی مسئلہ ہے جس پر اس وقت کی حکومت کی طرف سے عمل ہو رہا ہے۔ اس بارے میں مختلف مسالک کیا ہیں۔ اور آپ کس مسلک کو مزاجِ اسلامی سے قریب تر خیال فرماتے ہیں۔ اگر آپ کا مسلک بھی مذکورہ ہی ہے تو اس الزام سے بچنے کی کیا صورت ہے کہ اسلامی نظام جو یتیم کی دستگیری کا اسقدر مدعی ہے ایک یتیم کو محض اس لئے دادا کی وراثت سے محروم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو دادا کی وفات سے بعد تک زندہ نہ رکھ سکا؟

اس کا جواب، ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی طرف سے یہ دیا گیا ہے۔

جواب، فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ ویسے بھی یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے کیونکہ پوتا بہرحال اپنے باپ کے واسطے ہی سے دادا کے مال میں حقدار ہو سکتا ہے نہ کہ براہِ راست خود۔ اسی طرح بہو اپنے شوہر کے واسطے سے خسر کے مال میں سے حصہ پاسکتی ہے نہ کہ براہِ راست خود۔ اگر ایک شخص کا بیٹا اس کی زندگی میں مرجائے اور وہ شادی شدہ نہ ہو تو آپ خود مانیں گے کہ اس کا حصہ ساقط ہو جائے گا۔ یہ نہیں کہ اس شخص کے مرنے پر اس کے ترکہ میں سے اس کے فوت شدہ بیٹے کا حصہ بھی نکالا جائے اور پھر اس کی میراث اس کی ماں اور اس کے بھائیوں وغیرہ کو پہنچائی جائے۔ اسی طرح اگر فوت شدہ لڑکے کی کوئی بیوی موجود ہو تو آپ خود مانیں گے کہ وہ اپنے خسر کے ترکہ میں سے حصہ پانے کی مستحق نہیں ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا نکاحِ ثانی ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ پھر آپ کو کیوں اصرار ہے کہ صرف اس کا بیٹا موجود ہونے کی صورت میں اس کا حصہ ساقط نہ ہو بلکہ وہ اس کے بیٹے کو پہنچے؟

رہا یتیم کی پرورش کا سوال، تو شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کی پرورش کا انتظام کریں۔ نیز شریعت نے وصیت کا حکم اسی لئے دیا ہے کہ اگر کوئی مرنے والا اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو اور اس کے خاندان میں کچھ لوگ مستحق موجود ہوں تو وہ ان کے حق میں وصیت کرے ⅓ مال کی حد تک وہ وصیت کر سکتا ہے اور اس میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر وہ کوئی یتیم پوتا چھوڑ رہا ہے یا کوئی بیوہ بہو چھوڑ رہا ہے جو بے سہارا ہو، یا کوئی بیوہ بھاوج یا غریب بھائی یا بیوہ بہن چھوڑ رہا ہے تو ان کے لئے وصیت کر جائے۔ یہ گنجائش اسی لئے رکھی گئی ہے کہ قانونی وارثوں کے سوا خاندان میں جو لوگ مدد کے محتاج ہوں ان کی مدد کا انتظام کیا جاسکے۔

مودودی صاحب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ انھیں قرآن وحدیث میں کوئی ایسا حکم صریح نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے۔ لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں کہ "لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے"۔ یہی وہ تقلید ہے جس کی قرآن اس شدت سے مخالفت کر رہا ہے اور جس کی وجہ سے قوموں میں سوچنے اور سمجھنے کی قوت سلب ہو جاتی ہے اور وہ کالانعام بل ھم اضل کی (حیوانی' بلکہ ان سے بھی بدتر) سطح پر پہنچ جاتی ہیں۔ خود مودودی صاحب اپنی بیشتر تحریروں میں لکھ چکے ہیں کہ جن معاملات میں قرآن اور حدیث خاموش ہوں انھیں ہم اپنی بصیرت سے حل کریں گے۔ اس چیز کو انھوں نے "دستور پاکستان" کے اس خاکے میں بھی بیان کیا ہے جو ان کی طرف سے مرتب ہو کر شائع ہوا تھا۔ لیکن اب ان کا ارشاد یہ ہے کہ جو امور سلف سے خلف تک وراثتاً منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں ان کے خلاف رائے دینا مشکل ہے' خواہ ان کی تائید میں قرآن وحدیث کا کوئی حکم بھی نہ ملے۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے اس مسلک کی تائید میں دلائل لا کر (بزعم خویش) ثابت کیا ہے کہ یہ مسلک معقول بھی ہے۔ اب ان دلائل اور ان کی معقولیت کو دیکھئے۔ دلیل یہ ہے کہ

(ا) پوتا اپنے باپ کے واسطے سے ہی دادا کے مال میں حقدار ہو سکتا ہے' نہ کہ براہ راست جس طرح بہو اپنے شوہر کے واسطے ہی سے خسر کے مال میں حصہ پا سکتی ہے۔

(۲) فوت شدہ وارث کا حصہ نہیں نکالا جاتا۔ اس لئے یتیم پوتا اپنے دادا کے مال سے حصہ نہیں پا سکتا۔

یہ دلائل' عقل' علم اور قرآن سب کے خلاف ہیں۔ حتیٰ کہ فقہی قانون وراثت کے بھی خلاف۔

مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ "پوتا اپنے باپ کے واسطہ سے ہی دادا کے مال میں حقدار ہو سکتا ہے"۔ اور جب واسطہ نہ رہے تو یہ حق ساقط ہو جاتا ہے"۔ یہ دعویٰ بنیادی طور پر غلط ہے۔ ذرا اس نقشے کو سامنے لائیے جو پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ مودودی صاحب کے دعوے کی بنا پر' رشید' عمر کے واسطے سے زید کے مال کا حقدار ہے۔ اور حامد اس لئے زید کے مال کا حقدار نہیں کہ اس کا واسطہ (بکر) موجود نہیں ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا عمر کی موجودگی میں رشید اپنے دادا (زید) کے مال سے ایک پائی بھی پا سکتا ہے؟ عمر کی موجودگی میں' زید کے مال کا حقدار عمر ہی ہے نہ کہ رشید۔ یہ قانون وراثت کا ابتدائی قاعدہ ہے۔ اب دیکھئے کہ اس دلیل کی رو سے بات کیا بنی۔

(الف) حامد اپنے دادا (زید) کے مال سے حصہ نہیں پا سکتا کیونکہ ان دونوں کا درمیانی واسطہ (بکر) موجود نہیں ہے۔

(ب) رشید اپنے دادا (زید) کے مال سے حصہ نہیں پا سکتا کیونکہ ان دونوں کا درمیانی واسطہ (عمر) موجود ہے۔

اب اور آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب کی دلیل کو پھر دہرا لیجئے کہ حامد اپنے باپ (بکر) کے واسطے سے ہی زید کے مال کا حقدار ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ حامد اور زید کے درمیان واسطہ (بکر) نہیں رہا اس لئے حامد زید کے مال کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ لیکن مودودی صاحب کو شاید اس کا علم نہیں کہ اگر زید کی زندگی میں حامد فوت ہو جائے تو زید اس کے مال کا حقدار ہوتا ہے۔

اور یہ بھی کہ اگر زید کی زندگی میں عمر بھی فوت ہو جائے تو زید کی موت پر حامد اور رشید دونوں اس کے مال کے حقدار ہو جاتے ہیں۔

کیا مودودی صاحب بتائیں گے کہ

(۱) حامد اور زید کے درمیان کونسا واسطہ تھا جس کی رو سے زید، حامد کے مال میں حقدار بن گیا؟ اور

(۲) زید کی زندگی میں عمر کے مرجانے کی صورت میں، وہ کونسا واسطہ تھا جس کی رُو سے حامد اور رشید دونوں یتیم پوتے زید کے مال کے وارث قرار پاگئے؟

یہ تھی مودودی صاحب کی دلیل! حیرت ہے کہ انھیں (قرآن تو ایک طرف) فنِ وراثت کے ابتدائی اصولوں تک سے بھی واقفیت نہیں۔ مودودی صاحب نے یتیم پوتے کے ساتھ بیوہ بہو کی مثال پیش کرکے اس شبہ کو اور بھی قوی کردیا ہے کہ انھیں فی الواقعہ قانونِ وراثت کے مبادیات تک کا بھی علم نہیں۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ اس مثال سے عوام اس کے قائل ضرور ہوگئے ہوں گے کہ مودودی صاحب کی دلیل بڑی وزنی ہے۔ کیونکہ جب بکر کی بیوہ زید کے مال سے حصہ نہیں پا سکتی تو بکر کا بیٹا (حامد) کس طرح حصہ پائے گا!

قرآن کی رو سے رشتہ داروں کی دو قسمیں ہیں (اور یہ تقسیم ایسی کھلی ہے کہ ہر شخص اسے تسلیم کریگا)۔ ایک نسبی رشتہ دار یعنی وہ جو اشتراکِ نسب کی بنا پر رشتہ دار ہوں۔ مثلاً باپ، دادا، پردادا وغیرہ اور نیچے کی طرف بیٹا، پوتا، پرپوتا وغیرہ۔ یا بھائی بہن۔

دوسری قسم عقدی رشتے کی ہے جس میں میاں بیوی شامل ہیں۔ میاں بیوی کا رشتہ صرف نکاح کے عہد و پیمان سے ہوتا ہے اشتراکِ نسب کی بنا پر نہیں ہوتا۔ اس لئے میاں بیوی کا وارث ہوتا ہے اور بیوی میاں کی۔ بکر کی بیوہ، زید سے نہ تو نسبی رشتے میں ہے نہ اس کے عقد میں آئی ہے۔ پھر وہ زید کے مال میں کس طرح وارث ہو سکتی ہے؟ وہ اپنے شوہر کے مرنے پر اس کے ترکے سے وراثت پاسکتی ہے۔ زید سے اس کا وراثتی تعلق ہی نہیں۔ نسب کا رشتہ مستقل رشتہ ہوتا ہے لیکن عہدی رشتہ، صرف عہد و پیمان تک رہتا ہے۔ بیٹا، بیٹا ہی رہتا ہے خواہ اس کا باپ زندہ ہو یا مرچکا ہو۔ لیکن اگر بیوی سے عہدِ نکاح توڑ دیا جائے (یعنی طلاق دیدی جائے) تو اس سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ دادا اور پوتا نسبی رشتے دار ہیں۔ بکر زندہ ہے تو، مرگیا ہے تو، حامد بہرحال زید کا پوتا ہے۔ بہو اور خسر کا یہ رشتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے بہو اور خسر کی مثال سے دادا اور پوتے پر دلیل لانا یکسر غلط ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب کا یہ سوال سرے سے غلط ہے کہ کوئی شخص کسی واسطے سے متوفی کے مال میں حقدار ہوتا ہے، مثلاً (نقشے میں دیکھئے) زید کی موت پر (مودودی صاحب کے پیش کردہ مسلک کے مطابق) عمر کو زید کے ترکے سے ایک ہزار روپیہ ملا۔ رشید کا اس ہزار روپے میں ایک پائی کا بھی حصہ نہیں۔ عمر کے مرنے پر رشید، عمر کے مال کا حقدار ہوگا۔ اگر عمر نے اپنی زندگی میں وہ ہزار روپیہ خرچ کردیا جو اسے زید کے ترکے میں ملا تھا تو رشید کے حصے میں اس ہزار روپے میں سے پھر بھی کچھ نہیں آئے گا۔ لہٰذا یہ اصول ہی غلط ہے کہ رشید عمر کے واسطے سے زید کے مال میں حقدار ہوتا ہے۔ اصول اس کے برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ کوئی شخص واسطے کی موجودگی میں کسی کے مال میں حقدار نہیں ہوتا۔ اس اصول کی وضاحت ذرا آگے چل کر آئے گی جہاں واسطے کی بجائے حجب کا لفظ استعمال کیا جائے گا جو اس فن کی صحیح اصطلاح ہے۔

قرآنی احکام وراثت میں ہے کہ

(۱) للرجال نصیب مما ترک الوالدان ۴/۷

(۲) یوصیکم اللہ فی اولادکم ۴/۱۱

یعنی "اولاد" اپنے "والدین" کے ترکہ سے حصہ پاتی ہے۔ یہ حصہ خود خدا نے مقرر کر دیا ہے۔

ہمارے ہاں "اولاد" کے معنی عام طور پر صرف بیٹا، بیٹی کئے جاتے ہیں اور والدین کے معنی صرف ماں باپ۔ لیکن ان الفاظ کے معنی وسیع ہیں۔ ولد میں بیٹا اور بیٹے کی اولاد در اولاد (پوتا، پرپوتا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح والد میں باپ اور باپ کے والد در والد (دادا، پردادا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں۔ اس اصول کو فقہ میں بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ اولاد میں نیچے تک اور والدین میں اوپر تک سب شامل ہوتے ہیں۔

یہاں سے دوسرا سوال پیدا ہوا۔ مثلاً ایک شخص مر گیا۔ اس کا باپ، دادا، پردادا بھی موجود ہیں اور بیٹا، پوتا، پرپوتہ بھی۔ قرآن نے باپ کا حصہ بھی مقرر کیا ہے اور بیٹے کا بھی۔ لیکن جب "والد" کے اندر اوپر تک (دادا، پردادا) شامل ہیں اور "ولد" کے اندر نیچے تک (پوتا، پرپوتا) تو پھر ترکہ کی تقسیم کس طرح ہو؟ اس کیلئے قرآنی اصول اقرب کا ہے۔ اقرب کے معنی ہیں وہ شخص جس کے اور میت کے درمیان کوئی اور موجود نہ ہو۔ مثلاً

نور (دادا)
↓
بشیر (والد)
↑
متوفی ——— احمد ← (متوفی)
↓
خالد (بیٹا)
↓
نذیر (پوتا)

متوفی (احمد) سے اوپر کی طرف، متوفی کا باپ (بشیر) نور اور احمد کے درمیان روک (یا پردہ یا حجب) ہے۔ اس لئے احمد، نور کا اقرب نہیں ہے۔ اسی طرح نیچے کی طرف، خالد (بیٹا) احمد اور نذیر کے درمیان روک ہے۔ اسلئے احمد نذیر کا اقرب نہیں ہے۔ اس صورت میں احمد کے ترکے میں اوپر کی طرف بشیر اور نیچے کی طرف خالد حقدار ہوں گے۔ لیکن اگر احمد کی وفات کے وقت بشیر زندہ نہ ہو۔ تو احمد، نور کا اقرب ہو جائیگا اور جو حصہ بشیر کا تھا وہی حصہ نور کا ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر احمد کی وفات کے وقت خالد زندہ نہ ہو تو احمد، نذیر کا اقرب ہو جائیگا اسلئے جو حصہ خالد کا تھا وہی حصہ نذیر کا ہو جائے گا۔

اب پھر صفحہ ۷۲ کے نقشے کو دیکھئے۔ زید کی وفات کے وقت ایک طرف رشید اور زید کے درمیان عمر کی روک موجود ہے اس لئے زید کے ترکے میں عمر کی موجودگی میں رشید حصہ دار نہیں ہو سکتا۔ لیکن دوسری طرف حامد اور زید کے درمیان کوئی روک نہیں (جو روک تھی — یعنی بکر — وہ پہلے ہی اٹھ چکی ہے) اس لئے حامد، زید کے ترکے میں حقدار ہے اور قرآن نے (ایسی صورت میں) جو حصہ ولد کے لئے مقرر کیا ہے

وہ اسے ملے گا۔ اسی طرح حامد کی موت کی صورت میں حامد کے مال سے زید کو وہ حصہ ملے گا جو قرآن نے والد کے لئے مقرر کیا ہے۔ کیونکہ اب حامد اور زید کے درمیان کوئی روک نہیں۔ (روک ــــ بکر ــــ پہلے اٹھ چکی ہے)۔ اسی طرح، اگر عمر بھی زید کی زندگی میں مر چکا ہوتا تو رشید، زید کے مال سے اپنا حصہ لیتا کیونکہ اس صورت میں رشید اور زید کے درمیان کوئی روک نہ ہوتی۔

اس سے واضح ہے کہ

(۱) والدین اور اولاد کے جو حصے قرآن نے مقرر کئے ہیں وہ صرف ماں باپ اور بیٹی بیٹے کے حصے نہیں بلکہ اوپر تک اور نیچے تک مسلسل جاتے ہیں۔

(۲) حصہ اسی کو ملتا ہے جس کے اور متوفی کے درمیان کوئی حجاب (یا روک) نہ ہو۔ جب روک اٹھ جائیگی تو حصہ مل جائیگا۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کا اصول، کس طرح قرآنی اصول کی نقیض ہے۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ بیوہ بہو کو خسر کے مال سے کیوں حصہ نہیں ملتا۔ اس لئے کہ خسر کے مال میں بہو کا حصہ قرآن نے مقرر ہی نہیں کیا۔ اسلئے اس کے شوہر کی موجودگی یا اس کی وفات اس سوال پر اثر انداز ہی نہیں ہوتی۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ تم زید کے مرنے پر اس کے فوت شدہ بیٹے، بکر کا حصہ نکال کر حامد کو دیتے ہو، اور یہ غلط ہے۔

لیکن ہم پوچھتے یہ ہیں کہ بکر کا حصہ نکالتا کون ہے؟ (حصہ صرف اس کا ہوتا ہے جو متوفی کی وفات کے وقت زندہ موجود ہو ــ مُردوں کے حصے کوئی نہیں نکالتا)۔ قرآن کی رُو سے، حامد اپنے دادا (زید) کے ترکے میں حقدار ہے اس لئے حامد کو خود اس کا حصہ ملتا ہے نہ کہ اس کے متوفی باپ (بکر) کا حصہ۔ اگر بکر کا حصہ نکلتا تو اس کی بیوہ کو بھی کچھ مل جاتا۔ لیکن جب بکر کا حصہ ہی نہیں تو بیوہ یا بکر کے اور رشتہ داروں کو کیا ملے گا؟ پھر سن رکھئے کہ حامد کو براہ راست (زید کے ترکے سے) اپنا حصہ ملتا ہے نہ کہ اپنے متوفی باپ (بکر) کا حصہ۔

ان تصریحات کے بعد آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ ہمارے ملا کا یہ مذہب کہ یتیم پوتا، اپنے دادا کی میراث سے حصہ نہیں پا سکتا، کس طرح قرآن کی کھلی ہوئی مخالفت ہے اور ملا کے اس مسلک کی تائید میں مودودی صاحب کے دلائل کی حیثیت کیا ہے؟

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ "رہا یتیم کا سوال تو شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کی پرورش کا انتظام کریں۔" یعنی، قرآن نے اس یتیم کا جو حصہ مقرر کیا ہے اس سے اسے محروم کر دیا جائے (اور وہ حصہ اس کے چچا کو دلا دیا جائے) اور پھر اس محروم و یتیم کو خیرات کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرنے کیلئے مجبور کر دیا جائے۔ دوسری طرف اس کے چچا کو اس کی جائداد کا مالک بنا کر اس سے اپیل کی جائے کہ اس یتیم کی پرورش کرو۔ اللہ تمہیں اس کی جزائے خیر دیگا۔ قرآن میں یہودیوں کے متعلق آیا ہے کہ وہ پہلے اپنے بھائیوں کو دشمن کے حوالے کر دیتے تھے اور پھر انہیں فدیہ دیکر چھڑاتے تھے تاکہ اس سے ثواب حاصل ہو۔ اسی قسم کا انتظام یہ حضرات یتیم پوتے کے لئے کرتے ہیں۔

مودودی صاحب نے ضمناً وصیت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ "⅓ حصہ مال کی حد تک وہ وصیت کر سکتا ہے۔"

یہ چیز بھی قرآن کریم کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔ قرآن نے وصیت کا پورا پورا حق دیا ہے اور کہیں یہ نہیں لکھا کہ وصیت صرف ⅓ حصہ مال ہی میں ہو سکتی ہے۔ اللہ نے وصیت کے حکم میں کہیں یہ نہیں کہا کہ وصیت صرف ⅓ حصہ میں ہو سکتی ہے۔ لیکن ملا کہتا ہے کہ نہیں! تم وصیت صرف ⅓ حصہ تک کر سکتے ہو۔ یعنی (معاذ اللہ) خدا کو اتنی بات بھی نہیں کہنی آتی تھی کہ وصیت ⅓ حصہ میں کی جا سکتی ہے[1]۔ وہ اس کیلئے بھی روایات کا محتاج ہوگی۔ یہ ہے ملا کا روایاتی مذہب!!

جب ہم کہا کرتے ہیں کہ ملا کا مذہب بالکل نوایجاد ہے اور قرآن سے اسے کچھ تعلق نہیں تو بعض (ناواقف) حضرات کو اس سے بڑی حیرت ہوتی ہے اور وہ اسے صحیح تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ اب آپ صرف اس ایک مسئلہ میں دیکھ لیجئے (یعنی یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے میں) کہ قرآن کا حکم کیا ہے اور ملا کا مذہب کیا! اس کے بعد آپ خود سوچ لیجئے کہ جس چیز کو ملا "نظام شریعت" کہہ کر پکارتا ہے اُسے قرآن سے کسقدر تعلق ہوگا! ہزار برس سے مُلا اپنے اس غیر قرآنی مذہب کو لئے ہوئے آرہا ہے۔ نمعلوم اس سے کسقدر یتیم پوتے، محروم الارث ہو کر تباہ و برباد ہوئے ہوں گے۔ ہماری بدبختی کہ اب یہی غلط مذہب، ملک کا قانون بن گیا ہے۔ نمعلوم اب کسقدر مظلوم یتیم ہوں گے جو مُلا کی اس کند چھری سے ذبح ہو چکے ہوں گے اور آئندہ ذبح ہوں گے۔

بات تو اتنی ہی ہے جسے ہم اوپر لکھ چکے ہیں لیکن مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے ہم اس مضمون کو بھی دہرا دینا چاہتے ہیں جو اس سے قبل طلوع اسلام (بابت جون ۱۹۴۹ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ وھو ہذا۔

یتیم پوتے کا حصہ

کچھ عرصہ سے ہمارے پاس قرآن کریم کے قانون وراثت سے متعلق بہت سے استفسارات پہنچ رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں سوال یہ پوچھا جا رہا ہے کہ ہمارا مروجہ فقہی قانون جس کی رو سے یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے محروم کر دیا جاتا ہے قرآن کی رو سے کیسا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی چار مختصر سی آیات میں پورے کا پورا قانونِ وراثت جس حسن و خوبی اور جامعیت و اکملیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، جب نگۂ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو انسان، قرآن کے اس اعجاز پر وجد کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن جب اس کی نگاہ اس قانون پر پڑتی ہے جو ہمارے فقہا نے مرتب کیا ہے اور جو ہزار سال سے

---

[1] کہا جا سکتا ہے کہ جب قرآن میں وراثت کے حصے مُقرر ہو چکے ہیں تو پھر وصیت کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ سو قرآن نے وراثت کے احکام کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے (اور اسے بار بار دہرایا ہے کہ) یہ حصے وصیت پوری کرنے اور قرضہ ادا کر دینے کے بعد عمل میں آئیں گے۔ (من بعد وصیۃ یوصی بھا او دین)۔ یعنی وصیت کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ پورا مال وصیت سے .. (COVER) نہ ہوتا ہو۔ یا ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ انسان وصیت نہیں کر پایا اور اس کی موت واقع ہو گئی تو پھر تقسیم مال قرآنی حصوں کے مطابق ہوگی۔ یہ قانون کسقدر انسانیت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اس کے متعلق کسی اور وقت لکھا جائے گا۔

مسلمانوں میں مروج چلا آرہا ہے تو وہ ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ کس قسم کا قانون ہے! اس مروجہ قانون میں نہ صرف یہ کہ باہمدگر متضاد شقیں موجود ہیں بلکہ اس میں قرآنی اصولوں کی صریح مخالفت بھی ہے. جنھیں قرآن وارث قرار دیتا ہے یہ قانون انھیں وراثت سے محروم کر دیتا ہے. قرآن ان کے لئے کچھ حصہ مقرر کرتا ہے یہ قانون اس کے خلاف کچھ اور ہی دیتا ہے. کہیں ایک ہی درجہ کے دو رشتہ داروں میں ایک وارث قرار پاتا ہے دوسرا محروم رہ جاتا ہے اور سب سے بڑی افسوسناک صورت یہ کہ اس قانون کی رو سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ (معاذاللہ) خدا چوتھی جماعت کے بچوں جتنا بھی حساب نہیں جانتا. اس اصول کو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ جب کسی چیز کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے تو تمام حصوں کی حاصل جمع ایک (۱) آنی چاہئے. اگر حاصل جمع ایک نہیں آتی تو ریاضی کے ابتدائی قاعدے کی رو سے یہ تقسیم غلط ہے. مثلاً ($\frac{1}{2} + \frac{1}{4} + \frac{1}{4} = 1$) یہ تقسیم درست ہے. لیکن ($\frac{1}{2} + \frac{1}{2} + \frac{1}{3} = \frac{4}{3}$) یہ تقسیم غلط ہے کیونکہ ان حصوں کا مجموعہ (۱) نہیں بلکہ ($1\frac{1}{3}$) ہے۔

یہ ہے بہرحال وہ قانونِ وراثت جسے ہم بڑے فخر سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس سے ہم ایک طرف اللہ تعالیٰ کے متعلق کیا تصور پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف کس طرح علمی دنیا میں اپنے آپ کو اضحوکہ بناتے ہیں لیکن "مسلمانوں" کو اس کیا غرض کہ ان کے کسی عمل سے خدا کے متعلق کیا تصور پیش ہوتا ہے اور دنیائے علم و بصیرت میں ان کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے. انھیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے بس اسی طرح ہوتا چلا جائے اور جو شخص اس کے خلاف ذرا سی آواز بلند کر کے انھیں کہے کہ آؤ ہم اپنی روش کو اللہ کی کتاب کے مطابق کرلیں، اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے۔

اس مختصر سی تمہید سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہمارا مروجہ قانونِ وراثت پورے کا پورا ایسا ہے کہ قرآن کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے اور اس کی جگہ اس قانون کو رائج کیا جائے جو خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے. اس وقت ہم اس قانون کے اس ایک گوشے کو سامنے لائیں گے جس کے متعلق نمایاں طور پر استفسارات موصول ہوئے ہیں یعنی یتیم پوتے کی وراثت کا سوال۔

قانونِ وراثت چونکہ ایک فنی (Technical) مسئلہ ہے اس لئے اسے سمجھنے کیلئے ذرا دقتِ نظر کی ضرورت ہوگی. ہم کوشش کریں گے کہ اس کی فنی اصطلاحات سے بچ کر عام فہم اور سلیس انداز میں اسے پیش کریں لیکن اس کے باوجود آپ کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ اسے یونہی رواں نہ پڑھتے جائیں بلکہ ایک ایک ٹکڑے کو سمجھ کر آگے بڑھیں. وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اصل مسئلہ ہے کیا. یہ اس طرح سے سمجھ میں آجائے گا۔

زید

بکر (زید کی زندگی میں فوت ہوگیا) — عمر (زید کی وفات کے وقت زندہ ہے)

خالد (زندہ ہے) — حامد (زندہ ہے)

خالد اور حامد دونوں زید کے حقیقی پوتے ہیں. خالد یتیم ہے. حامد کا باپ زندہ ہے. زید کی وفات پر اس کی جائیداد کی تقسیم کا سوال پیش آتا ہے

ہمارا فقہی قانون وراثت کہتا ہے کہ اس جائداد میں خالد (جو یتیم ہے) کچھ حصہ نہیں پائے گا۔ جائیداد عمر کو ملے گی (اور اس کی وساطت سے اس کے بیٹے حامد کو)۔ اگر محض عقل عام کی رو سے بھی دیکھا جائے تو یہ فیصلہ سراسر ناانصافی پر مبنی دکھائی دیگا۔ خالد یتیم ہے۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں لیکن یہی اس کا جرم قرار دیا جاتا ہے اور اس طرح اسے اپنے باپ دادا کے ترکہ سے محروم کردیا جاتا ہے۔ اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ برابر کا حصہ لیتا۔ وہ مرچکا ہے اس لئے اب خالد کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اس کا چچا جائیداد کا وارث ہوگا۔

اب آیئے اس طرف کہ ہمارے فقہا اس کے لئے دلائل کیا پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں ان کی دو دلیلیں اہم ہیں۔

(۱) وہ کہتے ہیں کہ جو شخص، مرنے والے کے ساتھ، کسی دوسرے شخص کے واسطے سے رشتہ رکھتا ہے تو وہ شخص اسی واسطہ کی موجودگی میں ترکہ نہیں پا سکتا۔ یعنی خالد کا رشتہ اپنے دادا زید کے ساتھ اپنے والد بکر کے واسطے سے ہے براہ راست نہیں۔

ٹھیک ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ بکر تو مرچکا ہے اسلئے اب خالد اپنے مرحوم باپ کا قائم مقام ہے اور اس کے اور اس کے دادا (زید) کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کا چچا (عمر) درمیان میں واسطہ نہیں بن سکتا اس لئے کہ خالد کا اپنے دادا سے رشتہ، اپنے چچا عمر کے واسطہ سے نہیں ہے، اپنے باپ کے واسطے سے تھا اور یہ واسطہ اب درمیان سے نکل چکا ہے۔

اس مقام پر یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ہمارے فقہا خود اپنے وضع کردہ اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ وہ خالد کو اپنے دادا (زید) کی وراثت سے تو محروم کرتے ہیں لیکن اگر زید کی زندگی میں خالد مرجائے تو اس کی جائیداد زید کو دیدیتے ہیں۔ یعنی دادا تو یتیم پوتے کا براہ راست رشتہ دار ہوتا ہے لیکن وہی پوتا اپنے دادا کا براہ راست رشتہ دار نہیں ہوتا۔

اب ان کا دوسرا اصول لیجئے۔ دراصل یہ دوسرا اصول ہی وہ محکم اصول قرار دیا جاتا ہے جس کی رو سے یتیم پوتا، وراثت سے محروم کردیا جاتا ہے۔ یہ اصول ہے۔

الاقرب فالاقرب - یعنی قریب کے رشتہ دار کے ہوتے ہوئے بعید کا رشتہ دار محروم رہتا ہے۔

(دادا اور پوتے والی مثال میں) چونکہ عمر (زید کا بیٹا ہونے کی جہت سے) زید کا قریب کا رشتہ دار ہے اس لئے خالد (جو پوتا ہونے کی جہت سے زید کا بعید کا رشتہ دار ہے) عمر کی موجودگی میں محروم رہ جائے گا۔

زید

بکر (قریب کا رشتہ دار) — عمر (قریب کا رشتہ دار)

خالد (عمر کی موجودگی میں زید کا بعید کا رشتہ دار)

اول تو یہ سن لیجئے کہ ہمارے فقہاء خود اپنے اس اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ اصول یہ ہے کہ

قریب کے رشتہ دار کی موجودگی میں بعید کا رشتہ دار محروم رہ جاتا ہے۔

مثلاً رشید کا انتقال ہوگیا۔ اس کا دادا بھی موجود ہے اور بیٹا بھی۔ ظاہر ہے کہ بیٹا قریب کا رشتہ دار ہے اور دادا بعید کا۔ لہذا اس کے بیٹے

کی موجودگی میں اس کے دادا کو کچھ نہیں ملنا چاہئے۔ لیکن ہمارے فقہا دادا کو حصہ دیتے ہیں اور اس طرح خود اپنا قائم کردہ اصول بھی قائم نہیں رہنے دیتے۔

اب آیئے اس اصول کی طرف۔ اس اصول کو اس آیت سے مستنبط کیا جاتا ہے۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منه او کثر نصیبا مفروضا (۴)

مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا ہے اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا ہے خواہ ترکہ تھوڑا ہو یا بہت۔ ایک معین حصہ (جو بعد میں بیان کیا گیا ہے)

یہ آیت میراث کے قانون کی تمہید ہے۔ ہم اس وقت اس عظیم اصول کی تشریح میں نہیں جانا چاہتے جو اس قانون میں بیان کیا گیا ہے۔ نہ ہی اس میں کہ جب والدین خود اقربا میں شامل ہیں تو ان کا الگ ذکر کیوں کیا گیا۔ یہ نکات اپنے مقام پر سامنے آئیں گے۔ اس وقت صرف نقطہ زیر نظر کو زیر بحث رہنا چاہئے۔ آیت میں اقربون آیا ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ چونکہ رشتہ دار قرابت کے لحاظ سے بہت سے قریب اور بعید ہوتے ہیں، مثلاً والدین، اولاد، اولاد کی اولاد، بھائی، بہن، چچا، پھوپھی وغیرہ۔ اور یہ ممکن نہیں کہ سب کے سب خواہ قریب ہوں یا بعید، ایک ساتھ وارث ہوں، اس لئے وراثت کا مدار قربیت پر ہے۔ یعنی میت کے ترکہ میں سے اسی کو حصہ ملے گا جس کا وہ (مرحوم) اقرب ہوگا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اقربا جو چھوڑ کر مریں اس میں سے مردوں اور عورتوں کو حصہ ملے گا۔ یہ نہیں کہا کہ میت کے اقربین کو حصہ ملے گا۔ یہ فرق بڑا نازک ہے اور اس کو نظر انداز کر دینے سے تدوین فقہ کے وقت یہ اصول بنایا گیا کہ میت کا قریبی رشتہ دار اپنے سے دور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے اور اس اصول کی بنا پر یتیم پوتے کو، مرنے والے کے بیٹے کی موجودگی میں وراثت سے محروم کر دیا

یہ فرق چونکہ بڑا نازک ہے اسلئے اسے اور وضاحت سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمہارے اقربا جو چھوڑ کر مریں اس کی تقسیم یوں ہوگی۔ یعنی دیکھنا یہ ہوگا کہ مرنے والا اپنے زندہ رشتہ داروں میں سے کس کس کا اقرب تھا۔ اقرب کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اور میت میں کوئی درمیانی واسطہ موجود نہ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ زندہ رشتہ داروں میں سے جو میت کا سب سے قریبی ہو اس کو حصہ ملے گا، جو اس سے دور کا رشتہ دار ہو اسے حصہ نہیں ملے گا۔ ہر اقرب کو حصہ ملے گا۔ یعنی ہر اس رشتہ دار کو جس کے اور میت کے درمیان کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ مثلاً

سعید ——— کریم کا دادا زندہ ہے۔
رحیم ——— کریم کا والد فوت ہو چکا ہے۔
کریم ——— اس کی وفات ہوئی ہے۔
رشید ——— کریم کا بیٹا زندہ ہے۔

کریم کا قریب ترین رشتہ دار رشید ہے (بیٹا جو بلاواسطہ رشتہ دار ہے)۔ سعید (کریم کا دادا) کریم کا بالواسطہ رشتہ دار ہے۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ قریب ترین کی موجودگی میں، اس سے بعید رشتہ دار محروم ہو جاتا ہے تو رشید کی موجودگی میں سعید کو محروم ہو جانا چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ رحیم کی وفات کے بعد سعید اور رشید دونوں کریم کے اقرب ہو گئے۔ اوپر کی طرف کریم اور سعید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اور نیچے کی طرف کریم اور رشید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ لہٰذا اقرب کے معنی ہوئے وہ رشتہ دار جس کے اور متوفی کے درمیان، متوفی کی وفات کے وقت کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ جب صورت یہ ہے تو پھر پہلی مثال کو سامنے لائیے۔

زید

بکر (وفات پا چکا ہے) — عمر (زندہ ہے)

خالد (زندہ ہے) — حامد (زندہ ہے)

جس طرح اوپر کی مثال میں رحیم کی وفات سے سعید اور کریم اقرب (براہِ راست رشتہ دار) ہو گئے تھے اسی طرح بکر کی وفات سے زید اور خالد اقرب (براہِ راست رشتہ دار) ہو گئے ہیں۔ اور براہِ راست رشتہ دار (اقرب) وارث ہوتا ہے۔ لہٰذا خالد کو زید کے ترکہ میں سے حصہ ملے گا۔ حامد کو نہیں ملے گا، کیونکہ اس کے اور زید کے درمیان عمر موجود ہے۔ اگر عمر بھی فوت ہو چکا ہوتا تو پھر خالد کی طرح حامد کو بھی حصہ مل جاتا۔

وراثت کے قانون میں ایک چیز کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیئے اور وہ ہے قائم مقامی۔ باپ کی وفات سے بیٹا اس کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ بکر کی وفات سے خالد نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ وراثت کا سارا دارومدار قائم مقامی پر ہے۔ درمیانی واسطہ اٹھ جانے سے بعید کا رشتہ دار، درمیانی واسطہ کا قائم مقام اور اس طرح میت سے اقرب ہو جاتا ہے۔ اور قرآن کے حکم کے مطابق، مرنے والا (مورث) جن لوگوں کا اقرب ہو گا وہ لوگ وراثت پائیں گے۔ فقہا نے اقرب کا استعمال ورثہ (زندہ رشتہ داروں) کے لئے کیا جس سے بہت سی غلطیوں میں پڑ گئے۔ قرآن کے بیان کردہ اصول کے بعد ہم کو صرف یہ متعین کرنا تھا کہ میت کس کس کا اقرب ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی قاعدہ بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ فقہ نے لفظ اقرب کی نسبت بھی غلطی کی اور پھر جو قواعد اس پر متضرع کئے ان پر عمل کرنا ناممکن ہو گیا جس کی وجہ سے کہیں خود اپنے بنائے ہوئے قواعد کے خلاف چل نکلے اور کہیں قرآن کے بھی خلاف۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ ہمارے فقہا رحمہم اللہ نے دانستہ ایسا کیا۔ ہر انسان کے تفقہ میں غلطی کا امکان ہے اس لئے قصور اُن کا نہیں۔ اصل قصور ہے اس ذہنیت کا جس کی رو سے یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ اسلاف میں سے جو کچھ کسی نے کہہ دیا ہے وہ منزل من اللہ کی طرح تنقید کی حد سے بالا ہے اس لئے اس کے متعلق کسی پس آئندہ کا سوچنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ہمیں اپنے اسلاف کی فکر کے نتائج پر آنکھیں بند کرکے چلتے جانا چاہیئے۔ یہی اسلاف پرستی اس قوم کو لے ڈوبی۔ ابھی ایک مسئلہ وراثت کو لیجئے۔ قرآن نے وصیت کا حکم دیکر انفرادی مصالح کی حفاظت کا پورا پورا سامان کر دیا تھا۔ فقہ اور روایات نے وصیت کو ممنوع قرار دیکر ان تمام مصالح کو ختم کر دیا جس سے عجیب عجیب قسم کی الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ پھر قانونِ وراثت میں تفقہ کی غلطیوں نے قرآنی قانون کو کچھ سے کچھ بنا دیا جس سے کروڑوں

جائز وارث اپنے آبا و اجداد کی جائدادوں سے محروم ہو گئے۔ اگر اسلاف پرستی نہ ہوتی تو ایک ایک کی اجتہادی غلطی کی گرفت دوسرا کر لیتا اور اس طرح اس کے نقصانات آگے نہ بڑھتے۔ اس ایک مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون اسلامی کا مدار قرآن پر ہونا چاہیے تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے۔ آپ اندازہ فرمایئے کہ اگر ہم نے اس فیصلہ کے بعد کہ ہماری حکومت کا آئین اسلامی ہونا چاہیے، آئین و قانون سازی کا کام ان کے سپرد کر دیا جن کا عقیدہ ہے کہ فقہ اور روایات میں جو کچھ لکھا چلا آ رہا ہے وہ وحی منزل کی طرح منزہ عن الخطا رہے اور ہمیں اس پر تنقید کا کوئی حق نہیں، تو ان کا وضع کردہ آئین و قانون کس حد تک قرآنی ہو سکتا ہے؟ قرآنی آئین و شریعت صرف قرآن سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم قرآن سے باہر جائیں گے تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں گے۔

وفیہا بصائر للناس

محجوب الارث

(علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

[علامہ اسلم جیراجپوری نے یہ مضمون ۱۹۱۷ء میں لکھا تھا جب وہ ہنوز حدیث اور فقہ کو بھی دین سمجھتے تھے۔ یہ مضمون پہلے رسالہ معارف، اعظم گڑھ میں ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد الگ رسالہ کی شکل میں۔ چونکہ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ ایک عملی اہمیت رکھتا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس مضمون کو (جو اس وقت نایاب ہو رہا تھا) شائع کر دیں تاکہ اس مسئلہ کے تمام گوشے نکھر کر سامنے آجائیں۔ طلوع اسلام]

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الامین وعلی جمیع المسلمین الی یوم الدین۔ اما بعد
اسلامی فقہ فرائض میں ایک مسئلہ محجوب الارث کا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جو بیٹا باپ کی زندگی میں اپنے بچوں کو چھوڑ کر مر جاتا ہے اس کی یتیم اولاد اپنے دادا کے مرنے پر بشرطیکہ اس نے کوئی اور بیٹا بھی چھوڑا ہو اس کے ترکہ میں سے حصہ نہیں پاتی۔ مثلاً اگر مورث نے بروقت وفات ایک بیٹا اور ایک یتیم پوتا چھوڑا تو اس صورت میں سارے ترکہ کا مورث بیٹا ہوگا۔ اور پوتا محجوب الارث یعنی وراثت سے محروم قرار دیا جائے گا۔ صورت یہ ہے:

مثال

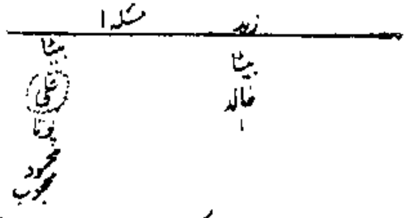

یہ حجب صرف اسی صورت میں محدود نہیں ہے بلکہ عصبات میں عام ہے۔ مثلاً ایک بھائی کی موجودگی میں دوسرے مردہ بھائی کی اولاد یا چچا کے ہوتے ہوئے چچا زاد بھائی بہن وغیرہ سب اسی قاعدے سے محجوب ہیں۔

اس مسئلہ کو فقہا نے اگرچہ ایک مقرر اور طے شدہ قانون بنا کر فقہ کی کتابوں میں لکھ دیا ہے۔ لیکن پھر بھی دیکھا جاتا ہے کہ عام طور پر مسلمان اس سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں۔ خاصکر جب دوسرے اہل مذاہب اعتراض کرتے ہیں اور قانون اسلام کو یتیموں کے خاندان سے خارج کرنے کا الزام دیتے ہیں تو ان کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے اور کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے۔

حال میں دو ایک قانون پیشہ اصحاب محجوب پوتے کی وکالت کے لئے اٹھے بعضوں نے اس کی حمایت میں اخباروں میں مضامین بھی لکھے، قانون ساز مجلس میں بھی تحریک کی لیکن قدامت پرست جماعت کے مقابلہ میں بہت جلد نوفل کی طرح جس نے مجنوں کو بچانے کیلئے

لیلیٰ کے قبیلہ پر چڑھائی کی تھی ناکام میدان سے ہٹ گئے اور بیچارہ پوتا کہتا رہ گیا:

ہم دل میں خوش کہ سبزۂ تربت ہرا ہوا وہ اس ادا سے روئے کہ پلکیں بھی نم نہیں

میرے دل میں ابتداہی سے جب سے میں نے فنِ وراثت کی تعلیم پائی یہ مسئلہ برابر کھٹکتا تھا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے ایک پھوپھی زاد بھائی حافظ عبدالاعلیٰ مرحوم جن کو بچپن ہی سے میرے ماں باپ نے تربیت اور تعلیم میں میرا ہمزاد بنا رکھا تھا اسی مسئلہ کا شکار تھے شیرخوارگی ہی کے زمانے میں ان کے والدین انتقال کر گئے تھے لیکن دادا زندہ تھے۔ اور ان کے اور بیٹے بھی تھے۔ بعد میں اگرچہ ان کے نیک دل دادا نے ان کی وراثت کیلئے باقاعدہ وصیت نامہ لکھدیا لیکن برادر مرحوم کی جوان مرگی نے ان سب جھگڑوں کا خاتمہ کردیا۔

میری توجہ اسی زمانے سے اس مسئلہ کی طرف لگی رہی اور متعدد دلائل سے میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ یہ مسئلہ مغز و منشائے اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن یہ سوچکر کہ ممکن ہے میری فہم نے غلطی کی ہو ایک عرصہ دراز تک ہندوستان کے مختلف اہل علم سے جو اس فن سے آشنا تھے اس مسئلہ کے متعلق خط و کتابت کرتا رہا جو مل گیا اس سے زبانی گفتگو کی۔ یہ سب لوگ میرے دلائل کے جوابات سے قطعاً قاصر رہے جس سے صاف روشن ہو گیا کہ یہ مسئلہ فقہ کی ایک ناقابل قبول غلطی ہے جس کی تقلید کسی طرح روا نہیں۔

اس بنیاد پر ۱۹۱۶ء میں میں نے اس بحث کو قلمبند کیا اور رسالہ معارف اعظم گڈھ کے جولائی اور اگست کے دو نمبروں میں شائع کرادیا۔ صحیح الخیال علماء اور قانون پیشہ اصحاب جن کو رات دن معاملات سے واسطہ پڑتا ہے، میرے ساتھ موافقت کی اور صرف وہ لوگ جو فقہائے سابقین کے مقلد ہیں اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے اور ان کو ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ وہ ان کے دفاتر میں کسی غلطی کے قائل نہیں کہ اس کی تحقیق کریں اور جو قائل بھی ہیں تو اس زمانہ میں اس کی اصلاح ناممکن سمجھتے ہیں۔

محجوب الارث کا مسئلہ کوئی فرضی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اکثر مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔ میرے پاس چونکہ فرائض کے سوالات بہت آتے ہیں اس وجہ سے اس مسئلہ سے بھی کبھی کبھی واسطہ پڑجاتا ہے۔

بعض دفعہ تو ایسی دردناک صورت پیش آگئی ہے کہ باپ کے سامنے وہی بیٹا اپنا کوئی معصوم بچہ چھوڑکر مرگیا ہے جو اس کے بیٹوں میں سب سے زیادہ لائق اور خدمتگزار تھا۔ جس نے باپ کی خوب خدمت کی اور اپنی کمائی سے اس کو غنی کردیا اور دوسرا بیٹا جو موجود ہے وہ نہایت نالائق اور ناکارہ ہے۔ پھر دادا کے مرنے کے بعد وہ یتیم بچہ جو اپنے باپ کے ظل عاطفت سے پہلے ہی محروم ہو چکا تھا اب اس کی پیدا کی ہوئی دولت سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور سارا ترکہ وہی ناکارہ اور آوارہ بیٹا لے لیتا ہے۔

میرے ایک دوست جو علی گڈھ میں نامور وکیل ہیں۔ ان کے یہاں ایک عورت چھوٹے چھوٹے چار بچوں کو نہایت خستہ اور تباہ حالت میں لئے ہوئے آئی اور رو رو کر اپنی دردبھری کہانی سنائی کہ سال گذشتہ طاعون میں میرا شوہر مرگیا، اب حال میں ان بچوں کا دادا بھی گذر گیا۔ ان کا ایک چچا ہی ہے جو نہایت نالایق اور آوارہ ہے، اس نے مجھے بچوں سمیت گھر سے نکال دیا، میرا میکہ اس قابل نہیں ہے کہ ان کو لیکر وہاں گزر کرسکوں، آپ وکیل ہیں۔ اللہ کے واسطے میری کچھ مدد فرمایئے اور بچوں کے دادا کی جائیداد میں سے جو بہت بڑی ہے عدالت سے چارہ جوئی کرکے کچھ ان کو دلایئے۔

وکیل صاحب کو رقت تو بہت آئی لیکن پھر اس کے کیا جواب دے سکتے تھے کہ افسوس ہے کہ تمہارے بچوں کو اسلامی قانون وراثت کی رو سے کچھ نہیں مل سکتا اس لئے عدالت میں دعویٰ کرنا فضول ہے۔

آخر وہ بیچاری باچشم تراں نیم مردہ معصوموں کو لیکر واپس چلی گئی۔

جب اس قسم کی پیش آنے والی کوئی صورت نظر پڑتی ہے تو لوگ یہ کوشش[1] کرتے ہیں کہ دادا اپنی زندگی میں محجوب اولاد کو کچھ دیدے کیونکہ چچاؤں سے امید کم ہوتی ہے اور چونکہ فطرت نے اولاد پر شفقت کرنے کا مادہ انسان میں رکھا ہے، اس لئے اکثر حالتوں میں دادا راضی ہو جاتے ہیں اور ان یتیموں کا تبرعًا و احسانًا اپنے مال میں سے کچھ حصہ دیدیتے ہیں۔

لیکن بعض سخت دل ایسے بھی ہوتے ہیں جو صاف صاف کہدیتے ہیں کہ صاحب جب ان کو اللہ نے نہیں دیا تو ہم دینے والے کون؟ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قانونِ وراثت کے مکمل ہونے کا دعویٰ جو کیا جاتا ہے وہ کہاں تک بجا ہے کہ ایک بیکس و یتیم بچہ اپنے بزرگوں کی زندگی بھر کی کمائی سے محروم ہو رہا ہے اور کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی۔

اسلئے کہ ایک طرف تو قانون وراثت اس کو محجوب الارث قرار دیتا ہے اور دوسری طرف خفہ دادا کے اوپر اس کے سلئے کوئی وصیت بھی فرض نہیں کرتی۔

اس صورت کو پیش نظر رکھکر یہ بھی سوچا جانا چاہئے کہ یہ قانون اس شفقت کے کہاں تک مطابق ہے جو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنی چاہتا ہے۔ اسلام تو سراسر رحم و مہربانی ہے، ہمارے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم دنیا والوں کیلئے رحمت اور بالخصوص یتیموں اور بیکسوں کیلئے شفیق والدین سے بڑھ کر تھے، آپ دنیا میں خود یتیم پیدا ہوئے تھے اور ابتداہی سے یتیموں سے اسقدر محبت اور الفت رکھتے تھے کہ جب مکہ معظمہ کی گلیوں سے گزرتے تھے تو یتیم بچے اپنی دولت سمجھ کر دوڑ دوڑ کے قدموں سے لپٹ جاتے تھے۔

چنانچہ آپ کے چچا نے آپ کی مدح میں جو اشعار کہے تھے ان میں سے ایک شعر یہ تھا۔

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ ثمال الیتامیٰ عصمۃ للارامل

ترجمہ: نورانی چہرہ والا جس کی برکت سے باران طلب کی جاتی ہے، یتیموں کا سرپرست اور بیواؤں کا نگہبان۔

تقریبًا اسی مضمون کو مولانا حالی مرحوم نے اس بند میں باندھا ہے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کی کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، یتیموں کا ماوی ضعیفوں کا حامی، غریبوں کا مولیٰ

کسی دوسرے ملک میں شاید یہ قانون اس قدر مضرت رساں نہ ثابت ہو جسقدر کہ ہندوستان میں ہے اسلئے کہ یہاں مسلمانوں میں بھی ایک قسم کے خاندان مشترکہ کا رواج ہے یعنی پشتہا پشت تک لوگ ایک ساتھ رہ کر زندگیاں گزارتے ہیں اور بیٹوں کی جو کچھ کمائی ہوتی ہے

---

[1] بعض مولوی اس کوشش کی بھی مخالفت کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس سے حقداروں کا حق زائل ہوتا ہے۔

وہ جب تک باپ زندہ رہتا ہے، اسی کی ملکیت میں منضم ہوتی جاتی ہے۔

اب اگر اتفاق سے کوئی بیٹا باپ کی زندگی ہی میں اپنا بچہ چھوڑ کر مرجاتا ہے تو چونکہ اس کی کوئی جداگانہ ملکیت قائم نہیں ہوتی اسلئے اس کا کچھ ترکہ ہی نہیں قرار پاتا اور سارا مال و منال بچہ کے دادا کے قبضۂ تصرف میں رہتا ہے، پھر جب دادا مرتا ہے تو دوسرے حصہ دار بیچ میں آکر حائل ہوجاتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ یتیم بچہ محجوب قرار پاجاتا ہے اور خود اس کے باپ کے گاڑھے خون کی کمائی دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔

اب ہم اس مسئلہ پر تفصیلی بحث شروع کرتے ہیں جس سے اس کی پوری حالت منکشف ہوجائے گی اور معلوم ہوجائے گا کہ آیا یتیم اولاد حقیقت میں محجوب ہے بھی یا نہیں۔ ہم جہاں تک غور کرتے ہیں قرآن اور حدیث تو خیر خود فقہ بھی اصولاً ان کو محجوب نہیں کرتی ہے۔

فقہاء نے حجب حرمان کو صرف دو اصول پر مبنی قرار دیا ہے۔

(۱) جو شخص مورث کے ساتھ کسی دوسرے شخص کے واسطہ سے رشتہ رکھتا ہے وہ اس وقت تک وراثت نہیں پاسکتا جب تک کہ وہ درمیانی شخص موجود ہے۔

(۲) الاقرب فالاقرب یعنی قریب کا رشتہ دار دور کے رشتہ دار کو محروم کرتا ہے۔ اصل الفاظ سراجی کے یہ ہیں:-

(وھو (حجب الحرمان) مبنی علی اصلین احدھما ان کل من یدلی الی المیت بشخص لا یرث مع وجود ذالک الشخص والثانی الاقرب فالاقرب۔

حجب حرمان دو اصول پر مبنی ہے، پہلا یہ کہ جو شخص میت سے کسی کے واسطے سے قرابت رکھتا ہے تو اس واسطہ کی موجودگی میں وارث نہیں ہوگا اور دوسرا الاقرب فالاقرب ہے۔

پہلا قاعدہ جس کو مختصر لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں ـــــ واسطہ کی موجودگی میں ذی واسطہ وارث نہیں ہوتا ـــــ یتیم پوتے کو کسی طرح محروم نہیں کرتا، اسلئے کہ پوتے کو دادا کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ بواسطہ اپنے باپ کے ہے۔ اور جب باپ جو واسطہ تھا موجود ہی نہیں ہے تو پھر پوتا کیوں محروم ہونے لگا۔

دوسرا قاعدہ الاقرب فالاقرب ہے اسی میں غلط فہمی واقع ہوئی ہے، اس کے ظاہری معنی خیال کرکے لوگوں نے یہ سمجھا کہ بیٹا جو قریبی رشتہ دار ہے، یتیم پوتے کو جو اس سے دور کا رشتہ دار ہے محجوب کردے گا۔

دراصل یہی اور صرف یہی ایک قاعدہ ہے جس کی بنیاد پر یتیم اولاد محجوب قرار دیجاتی ہے۔ لہٰذا ہم اپنی بحث کا مرکز بھی اسی قاعدہ کو قرار دیتے ہیں ـــــ اگر یہ قاعدہ الاقرب فالاقرب اپنے ظاہری معنوں میں رکھا جائے یعنی یہ کہ مطلقاً درجہ کے لحاظ سے جو قریب ہو وہ بعید کو محروم کردے تو وراثت کے بہت سے مسلمہ اور اجماعی مسائل ٹوٹ جائیں گے۔

مثال نمبر ۱

مسـ زید	مسئلہ ۶
دادا	بیٹا
۱	۵

اس مثال میں بیٹے کی موجودگی میں دادا کو حصہ ملا ہے، حالانکہ بیٹا میت سے بہ نسبت دادا کے اقرب ہے، کیونکہ بیٹا بلا واسطہ اس سے رشتہ رکھتا ہے اور دادا بواسطہ باپ کے اس کا رشتہ دار ہے۔

مثال نمبر ۲

زید — مسئلہ ٦

باپ	بیٹا	پڑنانی
۱	۴	۱

یہاں بیٹے اور باپ کے ہوتے ہوئے پڑنانی حصہ لے گئی جو نہایت دور کی رشتہ دار ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ[1] کو اسی پر تعجب تھا کہ بھتیجا پھوپی کا وارث ہوتا ہے اور پھوپھی بھتیجے کی وارث نہیں ہوتی، لیکن اگر موجودہ فقہ اُن کے سامنے ہوتی تو ان کو اور بھی حیرت ہوتی کہ نانی بلکہ پڑنانی تک تو نواسے کے ترکہ میں سے حصہ پاتی ہے اور نواسا ان میں سے کسی کا بھی ترکہ نہیں[2] پاتا۔ دادا محجوب الارث پوتے کا وارث ہوتا ہے اور محجوب الارث پوتا دادا کا وارث نہیں ہوتا۔

مثال نمبر ۳

زینب — مسئلہ ٦

شوہر	ماں	دو اخیافی بھائی	دو حقیقی بھائی	دو علاتی بھائی
۳	۱	۲	محروم	محروم

اس مثال میں کسی قاعدہ کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

حجب حرماں کا پہلا قاعدہ یہ چاہتا تھا کہ دونوں مادری بھائی جو ماں کے واسطہ سے رشتہ رکھتے ہیں اس کی موجودگی میں محروم ہوں لیکن نہیں ہوئے۔

دوسرا قاعدہ بھی یہی چاہتا تھا کہ ماں جو قریبی رشتہ دار ہے۔ مادری بھائیوں کو محروم کردے لیکن نہیں کرسکی۔

حقیقی اور علاتی بھائی جو قوت قرابت کے لحاظ سے اقوی اور اقرب تھے وہ بھی اخیافیوں کو نہیں محروم کرسکے بلکہ ان کی وجہ سے اُلٹے خود محروم ہوکر رہنے لگے۔

یہاں ہم بدنصیبوں کے جو حصہ میں نہیں آتی الٰہی رہ گئی کیا خوبیٔ قسمت وہیں بن کر

دنیا میں کون شخص ہے جو کہہ سکتا ہے کہ حقیقی بھائیوں کو محروم کرکے اخیافی بھائیوں کو حصہ دیدینا جو زیادہ تر اپنے کنبہ کے بھی نہیں ہوتے کسی معقول اصول وراثت پر مبنی ہے۔[3]

---

[1] چنانچہ کنز العمال میں ہے کہ وہ پھوپی اور خالہ کو محروم نہیں کرتے تھے۔

[2] تعجب پر تعجب یہ ہے کہ ماں جو کمتر وارث ہے وہ تو دادی کو محروم کردیتی ہے اور باپ جو قوی وارث ہے نانی کو نہیں محروم کرسکتا۔

[3] اصل بنیاد اس کی یہ ہے کہ اس آیت میں "وان کان رجل یورث کلالۃ او امرأۃ ولہ اخ او اخت" ابی بن کعبؓ کی قرأت کے مطابق اخ او اخت کے بعد "لام" کا اضافہ کرکے فقہا نے اخیافیوں کو ذوی الفروض میں داخل کردیا، اس لئے حقیقیوں سے جو عصبہ ہیں ان کا حق مقدم ہوگیا لیکن اس آیت کے جو معنی قرار دیئے گئے ہیں وہ بوجوہ ذیل ٹھیک نہیں

(۱) ابی بن کعبؓ جن کی قرأت کے مطابق معنی قرآن سے خارج ہیں ان کے "لام" قرأت کی روایت جہاں تک ہم کو معلوم ہے، بیہقی نے لکھی ہے جن کی تصنیفات کتب حدیث میں طبقۂ ادنیٰ کی ہیں۔ (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

یہ سوچنے کی بات ہے کہ جس رشتہ سے اخیافی وارث بنائے گئے ہیں حقیقیوں میں اگر باپ کے رشتہ کا نہ بھی خیال کیا جائے تو کم سے کم وہ رشتہ تو ضرور موجود رہے پھر ان کو محروم کرنے کے کیا معنی. چنانچہ امام مزنی کی کتاب المختصر میں ہے کہ اس صورت میں حضرت عمرؓ حقیقیوں کو محروم نہیں کرتے تھے۔

خود فقہا بعض جگہ دو قرابت والوں کو ایک قرابت والے سے اقویٰ قرار دیکر حصہ دلاتے ہیں، لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

مثال نمبر ۴

زید مسئلہ ۱۸

دو بیٹیاں	دو پوتیاں	پڑپوتی	سکڑپوتی	سکڑپوتا
۱۲	۲	۱	۱	۲

اس صورت کو فقہا مسئلہ تشبیب کہتے ہیں۔ اس میں بیٹیاں اقرب ہیں۔ ان کی موجودگی میں نیچے والیوں کو محروم ہونا چاہئے تھا. لیکن بخلاف اس کے پوتی، پڑپوتی، سکڑپوتی، سکڑپوتا جو سب نیچے اور مختلف درجہ کے ہیں آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بہن قرار دیئے گئے اور سب کو ترکہ میں سے حصہ مل گیا۔ لیکن ایک بدبخت یتیم پوتا ہی ہے جو اپنے باپ کی عدم موجودگی میں اس کے بجائے اپنے چچا کا بھائی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

لب شکرستاں وادحشمت سے بہ میخواراں منم کز غایت حرماں نہ با آنم نہ با اینم

ان متعدد اور مختلف قسم کی مثالوں سے صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ قاعدہ الاقرب فالاقرب اپنے ظاہری معنی میں یعنی یہ کہ مطلقاً درجہ کے لحاظ سے جو قریب ہے وہ بعید کو محروم کردے نہیں لیا جا سکتا ورنہ تمام اعتراضات مذکورہ وارد ہوتے ہیں۔

ان اعتراضات سے بچنے کیلئے یہ جواب دیا گیا کہ یہ قاعدہ یعنی الاقرب فالاقرب صرف عصبات میں ہے ذوی الفروض میں جاری نہیں ہوتا۔

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) (۲) یہ قرأۃ بمقابلہ قرأۃ متواترہ کے بالاتفاق تمام امت کے نزدیک نامقبول ہوئی، اور کسی نے کلام نہیں پڑھا۔ لہذا اس سے استدلال کرنا اس کو ایک ساتھ ہی نامقبول اور مقبول دونوں قرار دینا ہے۔

۳۔ فقہا اور مفسرین "لہ" کی واحد مذکر غائب کی ضمیر کو رجل اور امرأۃ دونوں کی طرف راجع کرتے ہیں جن میں سے امرأۃ مونث حقیقی ہے وہ کبھی اس کا مرجع ہو ہی نہیں سکتی، اس صورت میں لھما، یا لکل واحد منہما چاہئے تھا۔

۴۔ توریث کلالہ والی آیت میں جو آخر سورہ میں ہے اخ اور اخت کے الفاظ بعینہٖ یہی ہیں۔ اب اگر دونوں آیتیں انھیں کی توریث کے متعلق قرار دیجائیں تو دونوں کو ناقص کہنا لازم آتا ہے یعنی اس آیت میں "لاُمّ" کا لفظ اور اس میں لاَبٍ واُمّ یا لاَبٍ بڑھانا پڑے گا۔ حالانکہ اس کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔

۵۔ اگر اس آیت سے اخ اور اخت کی توریث مقصود بھی تو کیوں اللہ تعالیٰ نے لاُمّ نہیں فرمایا۔ وہ خود کہتا ہے "وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا" تفسیر کے موقع پر ابہام کلام کے نقائص میں سے ہے جس سے قرآن بہت بالاتر ہے۔ آیت کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں: "اگر کوئی مرد کسی کلالہ کا وارث بنایا جائے یا کوئی عورت۔ بحالیکہ اس کلالہ کے کوئی بھائی یا بہن ہو تو اس مرد یا عورت میں سے ہر ایک کو ایک ایک سدس ملے گا۔

"لہ" کی ضمیر کا مرجع کلالہ ہے۔ اور "لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا" میں تثنیہ کی ضمیر رجل وامرأۃ کی طرف راجع ہے نہ کہ اخ واخت کی طرف۔ یورث باب افعال سے ہے مجرد سے نہیں ہے۔

اس آیت میں بھائی اور بہن کا حصہ قطعاً نہیں بیان کیا گیا بلکہ عہدی رشتہ داروں کا ہے بھائی اور بہن کا ذکر صرف اسوجہ سے آگیا ہے کہ یہ والدین اور اولاد کی طرح عہدی رشتہ داروں کو محروم نہیں کرتے بلکہ ان کی موجودگی میں بھی وہ وارث ہو سکتے ہیں۔ (مزید تفصیل کیلئے ہماری کتاب الوراثۃ فی الاسلام (جاری ہے)

لیکن پھر اس پر بھی اعتراضات پڑتے ہیں کہ اچھا بالفرض اگر یہ قاعدہ صرف عصبات میں ہے اور ذوی الفروض میں نہیں ہے تو جدات جو ذوی الفروض ہیں ان میں قریب بعید کو کیوں محروم کرتی ہے، چنانچہ سراجی میں ہے۔

والقربیٰ من ای جھۃ کانت تحجب البعدیٰ من ای جھۃ کانت

جدہ قریبہ خواہ کسی طرف کی ہو جدہ بعیدہ کو خواہ کسی طرف کی ہو محجوب کردیگی۔

نیز بیٹیاں، پوتیوں کو اور حقیقی بہنیں جب ذوی الفروض ہوتی ہیں تو علاتی بہنوں کو کس قاعدہ سے محروم کرتی ہیں؟

ان اعتراضات سے مجبور ہوکر پھر فقہاء نے تسلیم کیا کہ الاقرب فالاقرب کا قاعدہ ذوی الفروض میں بھی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جن رشتہ داروں کی وراثت کا سبب متحد ہے، ان میں قریب بعید کو محجوب کرتا ہے یعنی ماں، نانی، پڑنانی، دادی، پڑدادی ان سب کے وارث ہونے کا سبب "امومت" ہے جو سب میں یکساں پایا جاتا ہے، اس لئے ان میں سے جو قریب ہوگی وہ بعید کو محروم کردیگی۔ نیز بیٹیوں اور پوتیوں میں بھی سبب وراثت متحد ہے یعنی "بنتیت" اس وجہ سے بیٹیوں کی موجودگی میں پوتیاں محروم ہوجائیں گی۔ علیٰ ہذا حقیقی بہنیں بھی بوجہ اتحاد سبب وراثت اور قرب کے علاتی بہنوں کو محجوب کردیں گی۔

یہاں تک آکر فقہاء اس بحث کو ختم کردیتے ہیں اور گویا یہ قاعدۂ دوم یعنی الاقرب فالاقرب ان کے خیال میں اپنی جگہ پر مضبوط اور مستحکم ہوگیا لیکن ابھی اعتراضات اور باقی ہیں اور بلا ان کے جوابات دیئے ہوئے یہ عقدۂ مشکل حل نہیں ہوسکتا۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ اتحاد سبب وراثت محض تمہاری خیالی توجیہ ہے، اس کو ہم تسلیم نہیں کرتے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی قسم کی بے بنیاد توجیہات سے اس فن میں خرابیاں واقع ہوگئی ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اتحاد سبب وراثت کو جب ترکہ دلانے میں دخل نہیں ہے تو محروم کرنے میں کیسے داخل ہوگیا۔ مثال نمبر ۳ میں اخیافی بھائیوں میں جو سبب وراثت پانے کا ہے وہی حقیقیوں میں بھی موجود ہے، پھر بھی حقیقی محروم کئے گئے، اور اخیافیوں کو ترکہ دیا گیا۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اتحاد سبب وراثت کو حجب حرمان میں اگر کوئی دخل ہے تو پھر ذوی الفروض ہی کے ساتھ اس کو کیا خصوصیت ہے۔ عصبات میں بھی یہی شرط لگانی چاہئے۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ بالفرض ہم نے آپ کے اس مشروط قاعدہ کو تسلیم بھی کرلیا کہ ذوی الفروض میں الاقرب فالاقرب کا قانون اس وقت جاری ہوگا جب ان میں سبب وراثت متحد ہوگا لیکن مندرجہ ذیل مثالوں میں یہ قاعدہ ٹوٹ جاتا ہے۔

مثال نمبر ۱ — زید مسئلہ ۶

بیٹی	پوتی	بھتیجا
۳	۱	۲

یہاں بیٹی اور پوتی کا سبب وراثت متحد ہے اور وہ دونوں ذوی الفروض میں سے ہیں، پھر بھی بیٹی نے جو اقرب ہے پوتی کو محروم نہیں کیا۔

مثال نمبر ۲ — زید مسئلہ ۶

حقیقی بہن	علاتی بہن	بھتیجا
۳	۱	۲

اس صورت میں بھی حقیقی اور علاتی بہنوں کی وراثت کا سبب متحد ہے اور دونوں ذوی الفروض ہیں، چاہئے تھا کہ حقیقی علاتی کو بوجہ اقرب ہونے کے محجوب کرتی۔

علاوہ بریں عصبات میں جہاں آپ نے قاعدہ الاقرب فالاقرب کو بلا کسی قید کے رکھا ہے وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود اتحاد سبب وراثت کے بھی قریب بعید کو محجوب نہیں کرتا۔ مثلاً مسئلہ تشبیب کو لیجئے جو مثال نمبر ۲ میں دکھلایا گیا ہے اس میں پوتی، پڑپوتی، سکڑ پوتی سب کے وارث ہونے کا سبب متحد ہے بلکہ چونکہ وہ سب کی سب سکڑنے کی وجہ سے عصبہ بنائی گئی ہیں اس وجہ سے ان کے عصبہ ہونے کا بھی سبب ایک ہی ہے، پھر بھی ان میں قریب نے بعید کو محجوب نہیں کیا اور سب کو ایک ہی درجہ میں رکھکر یکساں حصہ دیا گیا۔

اسی طرح جب عصبہ اور ذوی الفروض کا باہم اجتماع ہوتا ہے تو کہیں فقہا اس قاعدہ کو جاری کرتی ہے اور کہیں نہیں کرتی، بیٹا عصبہ کے ساتھ پوتی صاحبہ فرض محروم ہوجاتی ہے لیکن باپ عصبہ کے ساتھ نانی صاحبہ فرض محروم نہیں ہوتی۔

الغرض یہ صاف روشن ہوگیا کہ الاقرب فالاقرب کا قاعدہ جس معنی میں فقہائے استعمال کیا ہے کسی تاویل سے ٹھیک نہیں ہوتا بلکہ ہر پہلو سے خود انھیں کے مسلمات سے ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ایسے غیر مسلم قاعدے سے یتیم اولاد کو محجوب کرنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ الاقرب فالاقرب کے قاعدے میں اقرب کا ظاہری مفہوم اگر مراد لیا جائے یعنی یہ کہ مطلقاً درجے کے لحاظ سے جو قریب ہو وہ بعید کو محجوب کردے تو یہ قاعدہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، یہاں اقرب سے بجز اس کے کچھ مراد نہیں لیا جاسکتا کہ:

اقرب وہ رشتہ دار ہے جو بلاواسطہ مورث سے رشتہ رکھتا ہو یا باواسطہ لیکن بروقت وفات مورث کے وہ واسطہ موجود نہ ہو۔

جس طرح کہ میت کے مرنے کے وقت اگر اس کا باپ موجود نہیں ہے تو دادا بجائے باپ کے رکھا جاتا ہے اس لئے کہ بیچ میں جو واسطہ تھا یعنی باپ جس کی وجہ سے دادا محجوب ہوجاتا تھا وہ نہیں ہے، لہذا دادا اس واسطہ کی عدم موجودگی سے خود اقرب ہوگیا اور اب کوئی اقرب خواہ وہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو دادا کو محجوب نہیں کرسکتا۔

اسی طرح مورث کی وفات کے وقت اگر اس کا کوئی یتیم پوتا ہے تو وہ اپنے متوفی باپ کی جگہ رکھا جائے گا اور وہی حصہ لے گا جو اس کے باپ کا تھا، مورث کا جو بیٹا موجود ہے وہ اس کو محجوب نہیں کرسکتا۔ اسلئے کہ واسطہ کی عدم موجودگی سے وہ خود اقرب ہوگیا ہے۔ تعجب ہے کہ دادا کے معاملہ میں تو فقہا اقرب کا یہی مفہوم لیتے ہیں لیکن پوتے کے معاملے میں نہیں۔ پوتے کی بدنصیبی کے سوا اور اس کی کوئی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

من ازیں طالع شوریدہ برنجم ورنہ   بہرہ مند از سر کوئے تو دگرے نیست کہ نیست

حقیقت یہ ہے کہ وراثت کا سارا دارو مدار قائم مقامی پر ہے۔ لہذا جس بچہ کا باپ مرگیا ہے وہ وراثت میں اس کا قائم مقام سمجھا جائے گا۔ فقہانے اس مسئلہ میں اسی اصل نکتہ یعنی قائم مقامی کا لحاظ نہیں رکھا جس کی وجہ سے ایسی عظیم الشان غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ یتیم بچوں کو محجوب کرنے لگے۔ یہ امر غور کے قابل ہے کہ جس بیٹے کی موجودگی کی وجہ سے یتیم پوتے کو فقہا محجوب قرار دیتے ہیں وہ بیٹا صرف ایک ہی طرف سے کیوں حاجب ہوتا ہے یعنی صرف پوتے ہی کو دادا کے ترکہ سے کیوں محجوب کرتا ہے، دادا کو اس پوتے کے ترکہ سے کیوں نہیں محجوب کرتا

بلکہ دادا کی وجہ سے الٹا خود ہی محروم ہو جاتا ہے اس سے صاف نمایاں ہو جاتا ہے کہ قائم مقامی کے اصول پر وہ کسی طرح پوتے کا حاجب نہیں ہو سکتا۔

حاصل یہ کہ اقرب کا سوائے اس کے جو ہم نے اوپر لکھا ہے اور کوئی مفہوم ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی معنی لینے سے الاقرب فالاقرب کا قاعدہ جو تقسیم وراثت میں اصل الاصول اور بنیادی قانون ہے اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھ جاتا ہے۔

محجوب پوتے کو وارث بنانے پر ظاہر میں جو شبہات ہو سکتے ہیں ہم ان کو خود ہی لکھ کر ان کے جوابات بھی دیتے ہیں تاکہ اس مسئلہ کی اچھی طرح توضیح ہو جائے۔

شبہ اول: محجوب پوتے کو قرآن کریم کی رو سے کیسے ترکہ دیا جا سکتا ہے اس میں تو کہیں پوتے کا ذکر نہیں، صرف اولاد کا لفظ ہے جس کے معنی بیٹا بیٹی کے ہیں۔

جواب: اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ غیر محجوب پوتوں کو فقہا بھی تو ترکہ دلاتے ہیں بس جو آیت ان کی وراثت کی دلیل قرار دی جائیگی وہی ہماری بھی دلیل ہوگی۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ اولاد کا لفظ جو قرآن میں ہے اس کے معنی صرف بیٹا بیٹی کے نہیں ہیں بلکہ نیچے تک تمام اولاد اس میں داخل ہے تفسیر خازن میں آیت ولھن الربع مما ترکتم کے ذیل میں لکھا ہے :-

اسم الولد یطلق علی الذکر والانثی ولا فرق بین الولد وولد الابن وولد البنت فی ذلک

ولد کا لفظ مذکر و مؤنث دونوں کیلئے بولا جاتا ہے اور اس میں اولاد، اور بیٹے کی اولاد اور بیٹی کی اولاد میں کوئی فرق نہیں۔

فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد ۱۲ صفحہ ۸ مطبوعہ مصر میں ہے :-

الولد اعم من الذکر والانثی ویطلق علی الولد الصلب وعلی ولد الولد وان سفل۔

ولد کا لفظ مذکر اور مونث دونوں سے عام ہے، اور صلبی اولاد اور نیچے تک اولاد کی اولاد پر بولا جاتا ہے۔

فقہا بھی اس کے ساتھ متفق ہیں اور ولد میں ولد الابن کو داخل سمجھتے ہیں۔ شریفیہ شرح سراجی صفحہ ۲۶ مطبوعہ مطبع یوسفی لکھنو میں ہے۔

ولد الابن داخل فی الولد لقولہ تعالیٰ یا بنی آدم

اولاد میں بیٹے کی اولاد بھی داخل ہے کیونکہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کہا ہے۔

آیت توریث میں جہاں جہاں بھی ولد کا لفظ آیا ہے ہر جگہ بالاتفاق فقہا نے نیچے تک تمام اولاد نر و مادہ کو اس میں داخل سمجھا ہے۔ مثلاً

فان کان لھن ولد فلکم الربع مما ترکن

اگر ان کی (تمہاری بیویوں کی) کوئی اولاد ہو تو ان کے ترکہ میں سے تم کو چوتھائی ملیگا۔

فقہا میں سے ایک نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ بیویاں جب صلبی بیٹا یا بیٹی چھوڑ کر مریں اسی وقت شوہروں کو چوتھائی ملے گا بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ وہ پوتا، پوتی، پڑپوتا، پڑپوتی کسی کو بھی اگر چھوڑیں تو شوہر کو چوتھائی ملے گا۔

اولاد تو پھر بھی ایک عام لفظ ہے، ابن و بنت کے الفاظ جو عربی زبان میں خاص بیٹا بیٹی کے لئے وضع کئے گئے ہیں وہ بھی قرآن میں کئی جگہ وسیع معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں، اور نیچے تک کی تمام اولاد کو شامل ہیں، جا بجا اللہ تعالیٰ نے ہم کو "یا بنی آدم" کہکر خطاب کیا ہے بیسیوں نسلیں حضرت یعقوب کی گزر گئی تھیں لیکن ان کی اولاد قرآن میں یا بنی اسرائیل کہہ کر پکاری گئی۔

دور کیوں جایئے خود آیت وراثت ہی کے ایک رکوع کے بعد ہے، حرمت علیکم امھاتکم وبناتکم، یہاں بنات کے لفظ کو تمام فقہا نے بیٹیوں، پوتیوں، پڑپوتیوں، یہانتک کہ نواسیوں پر بھی شامل تسلیم کیا ہے، اس لئے آیت وراثت میں جو اولاد کا لفظ ہے اس میں یقیناً پوتا داخل ہے اور کسی طرح خارج نہیں ہو سکتا۔

اور یہ مجازاً نہیں ہے بلکہ حقیقتاً ہے، جیسا کہ علامہ ابوبکر ابن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے۔ کیونکہ ولد کا لفظ ولادت سے مشتق ہے، اسلئے اولاد کی اولاد بھی حقیقتاً اولاد ہے جس طرح کہ جزکا جز بھی یقیناً جز ہے۔

شبہ دوم: جب محجوب پوتے کو وراثت دلائی جاتی ہے تو پھر سب پوتے برابر ہیں، ہر ایک کا رشتہ دادا کے ساتھ یکساں ہے۔ لہذا صرف وہی پوتا کیوں دادا کا ترکہ پائے جس کا باپ دادا سے پہلے مرگیا ہے، وہ پوتے بھی کیوں نہ وارث ہوں جن کے باپ موجود ہیں۔

جواب: جن پوتوں کے باپ موجود ہیں، اصل میں محجوب وہی پوتے ہیں، کیونکہ ان کے باپ خود ان کے اور ان کے دادا کے درمیان حاجب ہیں، نہ وہ دادا کا ترکہ پوتے کو پہنچنے دیتے ہیں اور نہ پوتے کا ترکہ دادا کو بلکہ دونوں طرف سے بیچ میں خود ہی وارث بن جاتے ہیں اسلئے وہ پوتے جن کے باپ موجود ہیں دادا کے مرنے پر اقرب نہیں ہو سکتے، بخلاف اس پوتے کے جس کا باپ مرگیا ہے کیونکہ واسطہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ دادا کا اقرب ہو جائے گا اسلئے وارث ہوگا۔

بعینہ اس کی مثال ایسی ہے جس طرح کوئی شخص نانی، دادی، اور باپ کو چھوڑ کر مرجائے، ظاہر ہے کہ دادی کو میت کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ کسی طرح نانی کے رشتہ سے کم نہیں ہے، لیکن بوجہ اس کے کہ باپ درمیان میں حاجب موجود ہے دادی محجوب ہو جاتی ہے اور نانی حصہ پا جاتی ہے کیونکہ نانی اور مورث کے درمیان کوئی حاجب موجود نہیں ہے۔

شبہ سوم[1]: بیٹا اور پوتا دونوں عصبہ ہیں اور عصبات میں یہ قاعدہ ہے کہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ "اولی رجل ذکر" یعنی قریب ترین مرد نر کو دیا جاتا ہے۔ اسلئے بیٹے کے ہوتے ہوئے اس قانون کی رو سے یتیم پوتے کو کچھ نہیں ملے گا۔

جواب: اگر عصبات میں "اولی رجل ذکر" کو آپ بطور قانون کلی کے قرار دیتے ہیں تو خود کیوں اس کو جا بجا توڑتے ہیں، مثلاً

مسـ

دو بیٹیاں	بہن	بھتیجا
۲	۱	محروم

اس مثال میں بیٹیاں ذوی الفروض ہیں، ان کو دو ثلث دینے کے بعد جو کچھ بچا تھا وہ اس قاعدہ کی رو سے بھتیجے کو جو اقرب ترین مرد نر ہے ملنا چاہئے تھا، لیکن وہ تو محروم کردیا گیا، اور بہن جو زنِ مادہ ہے بقیہ کی وارث ہوگئی۔

---

[1] یہ شبہ علمائے اہل حدیث کی طرف سے کیا گیا ہے۔

علیٰ ہذا مسئلہ تشبیب یعنی مثال نمبر۴ کو دیکھئے اس میں مرد نر اور زن مادہ سب کو ایک ساتھ وارث بنایا گیا ہے کیا قانون کلی ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جو قدم قدم پر ٹوٹ جایا کریں؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث: الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھی لاولی رجل ذکر۔" ذوی الفروض کو ان کے حصے دیکر بقیہ قریب ترین مرد کو دیدو" کسی خاص مسئلہ کے متعلق فرمائی گئی ہے. مثلاً یہ صورت فرض کیجئے کہ کوئی شخص ماں، بیٹی، باپ، چچا اور بھائی کو چھوڑ کر مرگیا اس کے بارہ میں یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ ذوی الفروض کے حقوق دیکر جو کچھ بچے قریب ترین مرد کو دیدو لیکن اس کو ایک عام اصول قرار دے لینا صریحاً قرآن کے منافی ہے۔

مثال نمبر۱

زید مسئلہ ٦ (١٨)

ماں	بیٹی	بیٹا
٣	٥	١٠

یہاں ماں کو ایک سدس دینے کے بعد آپ کے اس قانون کلی کے مطابق بقیہ پانچ سدس بیٹے کو ملنا چاہئے لیکن قرآن مجید اس کے برخلاف اس صورت میں بیٹا اور بیٹی دونوں کو وارث بناتا ہے اور بیٹے کا نصف بیٹی کو دلاتا ہے۔

زید مسئلہ ٦ (١٨)

ماں	بیٹی	بہن	بھائی
٣	٩	٢	٤

اس صورت میں ماں اور بیٹی جو ذوی الفروض ہیں ان کا حصہ دینے کے بعد بقیہ بھائی کو ملنا چاہئے تھا کیونکہ وہ "اولیٰ رجل ذکر" ہے لیکن قرآن کریم بھائی اور بہن دونوں میں للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق ترکہ تقسیم کرنے کا حکم دیتا ہے.

اب سوچئے کہ یہ حدیث جس کی صحت پر تمام اہل سنت متفق ہیں قانون کلی قرار دینے سے ان کے خلاف پڑتی ہے اور غلط ہوئی جاتی ہے اس لئے یقیناً یہ کسی خاص مسئلہ ہی کے متعلق ہوسکتی ہے.

یہاں ایک امر اور غور کے قابل ہے کہ آپ جہاں اس کو قانون کلی قرار دیتے ہیں کہ بقیہ "اولیٰ رجل ذکر" کو ملنا چاہئے۔ وہاں اس حدیث کو بھی قانون کلی ہی سمجھتے ہیں کہ "اجعلوا الاخوات مع البنات عصبۃ" بہنوں کو بیٹیوں کے ساتھ عصبہ بنادو۔

اس مثال نمبر۲ میں بتائیے تو سہی کہ آپ نے اپنے ان دونوں کلی قوانین میں سے کس پر عمل کیا ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ بیٹیوں کے ساتھ بہنوں کو بھی حصہ مل سکتا ہے، یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ اولاد کے ساتھ بہنوں کو وارث بناتے ہیں وہ آئیں ہم ان کے ساتھ مباہلہ کیلئے تیار ہیں کہ جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہو۔

شبہ چہارم: صحیح بخاری کتاب الفرائض میں ہے۔ ولا یرث ولد الابن مع الابن۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وراثت نہیں پاتا۔

جواب: اس جملہ کے معنی تو یہ ہوئے کہ "بیٹے کی اولاد خود اس بیٹے کی موجودگی میں وراثت نہیں پاتی" اسلئے کہ اس جملہ میں

دونوں جگہ لفظ ابن پر الف لام تعریف کا ہے اور اصول فقہ میں یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ایسی صورت میں دونوں سے مراد ایک ہی ذات ہوتی ہے، چنانچہ نورالانوار میں ہے:۔

المعرفۃ اذا اعیدت کانت الاولی عین الثانیۃ

معرفہ جب دوبارہ لایا جائے گا تو پہلا بعینہ دوسرا ہوگا۔

چنانچہ اسی بنیاد پر اس میں لکھا ہے کہ اس آیت میں

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا

یقیناً دشواری کے ساتھ آسانی ہے یقیناً دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔

عُسر ایک اور یُسر دو سمجھے گئے ہیں سند میں شاعر کا یہ شعر پیش کیا ہے:۔

اذا اشتدت بك البلوی ففکر فی الم نشرح　　فعسر بین یسرین اذا فکرته فافرح

جب تجھ پر بلاؤں کی شدت ہو تو الم نشرح کی سورت میں غور کر کیونکہ ایک دشواری دو آسانیوں کے درمیان ہے یہ سوچ کر خوش ہو جا۔

اصول فقہ کی رو سے اس کے معنی یہی ہوئے کہ بیٹے کی موجودگی میں خود اس کی اولاد محروم رہتی ہے یہ نہیں کہ کسی بیٹے کی موجودگی میں وہ حصہ نہ پائے، اس لئے یہ ہمارے مدعا کے مخالف نہیں ہے بلکہ مطابق ہے۔

علاوہ بریں یہ حدیث نبوی نہیں ہے، صرف حضرت زید بن ثابت کا قول ہے اور تفسیر اور حدیث کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم وراثت کے مسائل میں اکثر رائے رکھتے تھے اور ان میں باہم ایک دوسرے سے اختلاف ہو جاتا تھا، چنانچہ کئی مسئلوں میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت زید بن ثابت میں اختلاف واقع ہوا ہے اور ایک نے دوسرے کی رائے کو تسلیم نہیں کیا۔ فتح الباری میں جد کے متعلق ایک قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کی وراثت کے بارے میں اپنے زمانے میں سو فیصلے کئے اور سب ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

شبہ پنجم: امام بخاریؒ نے یہی باب باندھا ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں بیٹے کی اولاد وراثت نہیں پاتی۔

جواب: بیشک، لیکن جو دلیل وہ اس کے اوپر لائے ہیں وہ ایک تو یہی حضرت زید بن ثابتؓ کا قول ہے جس کے متعلق تفصیل کے ساتھ ہم لکھ چکے ہیں، دوسری "اولیٰ رجل ذکر" والی حدیث ہے جس کے بارہ میں ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ صرف کسی جزئی مسئلہ کا حکم ہے، قانون کلی نہیں ہو سکتی۔

شبہ ششم: جب بڑے بڑے علماء و فقہائے امت نے جن کی بزرگی اور علمی عظمت کو تم خود تسلیم کرتے ہو اپنی کتابوں میں تصریح کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں یتیم اولاد محجوب ہوتی ہے تو پھر تم اس مسئلہ کو کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ [1]

جواب: ان تصریحات سے میں بھی واقف ہوں لیکن فقہی مسائل میں ہم کو ہر ایک فقیہ سے خواہ وہ کتنا ہی معظم و محترم کیوں نہ ہو

---

[1] یہ بات میرے جواب میں مدرسہ دیوبند کے مفتی صاحب نے لکھی ہے۔

اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے، اور خاص کر اس مسئلہ میں جس کی عدم صحت کے قوی دلائل ہمارے پاس موجود ہوں، ایسے تنازع کی صورت میں قرآن مجید یہ حکم دیتا ہے۔

فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر

تم کسی بات میں آپس میں جھگڑ پڑو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو اگر اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔

اس لئے تاوقتیکہ کتاب اللہ کی کسی آیت سے اس مسئلہ کا ثبوت نہ دیا جائے، یا کوئی حدیث صحیح یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا کوئی فیصلہ پیش نہ کیا جائے اس وقت تک ہم کیونکر ایسا مسئلہ تسلیم کرلیں جو اسلامی شفقت بلکہ انسانی فطرت کے بھی خلاف معلوم ہوتا ہے، اور جس کے مان لینے سے دشمنان اسلام کو اسلام کے قانون پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے۔

علمائے امت نبی تو نہیں ہیں کہ معصوم ہوں چنانچہ خود ان میں باہم بیشمار اختلافات ہیں قطعی حجت صرف کلام اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہی ہے اور بس۔

قرآن اور حدیث دونوں متوفی بیٹے کی اولاد کو قطعاً محروم نہیں کرتے، فقہ میں اقرب کا صحیح مفہوم متعین نہیں کیا گیا، جس کی وجہ سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ یتیم اولاد محجوب قرار پاگئی، حالانکہ خود فقہا کے یہاں اس کے خلاف مثالیں موجود ہیں، مثلاً بیٹی کے ساتھ پوتی کو بھی وہ حصہ دلاتے ہیں، نیز پوتی، پڑپوتی، سکڑپوتی سب کو ایک درجہ میں رکھ کر برابر ترکہ دیتے ہیں لیکن یتیم اولاد کے بارے میں آکر یک قلم محجب حرمان کا فرمان صادر کر دیتے ہیں۔

باکہ ایں نکتہ تواں گفت کہ آں شیریں لب — کشت ما را ودم عیسیٰ مریم با اوست

یتیم اولاد کو خاندانی حقوق سے خارج کر دینا اور ان کو ہمیشہ کیلئے ان کے آباؤ اجداد کی جائداد اور ملکیت سے محروم کر دینا ایک ایسا خلاف فطرت قانون ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر انصاف پسند عقلا اس کو جائز رکھتے ہیں، کوئی شخص ٹھنڈے دل سے سوچکر انصاف سے کہے کہ خدانخواستہ اگر وہ خود یا اس کی اولاد اس قانون کی رو سے محجوب ہو تو کیا وہ اس کو پسند کرے گا؟ لہذا ہرچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند، قرآن میں ہے:۔

ولیخش الذین لو ترکوا من خلفھم ذریۃ ضعافا خافوا علیھم فلیتقوا اللہ ولیقولوا قولا سدیدا

اور ان لوگوں کو خوف کرنا چاہئے جو اگر اپنے بعد ناتوان اولاد چھوڑ جاتے تو ان پر ترس کھاتے اسلئے ان کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور ٹھیک بات کہیں۔

پوتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے۔

واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا وجعل لکم من ازواجکم بنین وحفدۃ ورزقکم من الطیبات افبالباطل یؤمنون وبنعمۃ اللہ ھم یکفرون۔

اور اللہ نے تمہیں میں سے تمہاری بیویوں کو پیدا کیا اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور پاک چیزوں سے تم کو روزی عطا فرمائی۔ کیا پھر بھی لوگ جھوٹے معبودوں پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔

کیا نعمت الٰہی کی قدر و حرمت یہی ہے کہ وہ خاندان سے خارج اور اپنے باپ دادا کی کمائی اور محنت کے ثمرہ سے محروم کردی جائے اور در بدر ٹھوکریں کھاتی پھرے۔

یتیم اولاد کے محجوب کرنے میں صرف یہی برائی نہیں ہے کہ وہ اسلامی شفقت اور انسانی فطرت کے خلاف ہے بلکہ معاشرت میں اس سے خرابیاں واقع ہوسکتی ہیں۔

ایک خرابی تو یہ ہے کہ محجوب اولاد کے دلوں میں محرومی کی وجہ سے رنجش پڑجاتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص فرشتہ تو نہیں ہے کہ مادی جذبات سے بالاتر ہو، انسان کی فطرت اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ جب وہ دیکھتا ہے کہ میرے ہی بزرگوں کی کمائی سے جن کا خون میری رگوں میں گردش کر رہا ہے، میرے چچازاد بھائی تو عیش و عشرت کر رہے ہیں اور میں بلا کسی قصور کے اس سے بالکل محروم ہوں تو اس کو صبر نہیں آتا۔

سخن درست بگویم نمے توانم دید   کہ مے خورند حریفان و من نظارہ کنم

اس رنجش کی بدولت خاندان میں ایک دائمی عداوت کی بنیاد قائم ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے دینی اور دنیاوی برکتیں مفقود ہوجاتی ہیں اور ترقی نہیں ہوتی بلکہ بعض حالتوں میں یہ عداوت خاندان پر تباہی اور بربادی لاتی ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ سب لائق بیٹوں کو جو باپ کے خدمت گزار ہیں اور اس کی ملکیت کے انتظام و ترقی میں دن رات محنت اور کوشش کرتے ہیں، یہ یقین ہوجائے گا کہ اگر اتفاقاً وہ اپنے باپ سے پہلے مرگئے تو ان کی اولاد محجوب ہوجائے گی۔ تو وہ باپ کی خدمت اور اس کے کاروبار سے پہلو تہی کرنے لگیں گے اور اپنی کمائی اور کوشش سے اپنی جداگانہ ملکیت پیدا کرنے کی فکر میں پڑجائیں گے کہ اگر احیاناً ایسا حادثہ پیش آجائے تو ان کی اولاد کے پاس کچھ سرمایہ رہے اور وہ بالکل ہی دست نگر اور محتاج نہ رہ جائے، اسلئے کہ یہ امر فطرتی ہے کہ انسان کو اپنے ماں باپ سے زیادہ اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے۔

تو ایسی حالت میں جبکہ بیٹے اس خیال میں پڑجائیں گے نہ باپ کی جائیداد اور ملکیت کا انتظام درست ہوگا نہ اس میں ترقی ہوسکے گی۔ علاوہ بریں باپ کو اپنے بڑھاپے کے زمانے میں بھی جو توبہ اور عبادت کا وقت ہے اپنے دنیاوی کاروبار سے سبکدوشی حاصل نہ ہوسکے گی، اور اولاد سے وہ جائز آسائش اس کو نہ مل سکے گی جس کی عہدِ پیری میں ان سے توقع کی جاتی ہے اور نہ اولاد ہی اس کی خدمت کرکے سعادتمندی حاصل کرنے کے قابل ہوگی۔

تیسری خرابی ایک مثال سے سمجھ میں آسکتی ہے، فرض کیجئے کہ ایک دولتمند کے دو بیٹے ہیں جن میں سے ایک بیٹے کے چار بیٹے، ایک کا صرف ایک ہی بیٹا ہے، اب اگر چار بیٹوں کا باپ خود اپنے باپ کی زندگی ہی میں مرجائے تو اس کے چاروں بیٹے محجوب الارث کے قانون کی رو سے سمجھیں گے کہ جو کچھ خاندانی ملکیت ہے وہ دادا کے مرنے پر چچا کو اور پھر اس سے منتقل ہوکر چچازاد بھائی کو ملے گی۔ ہم چاروں بھائی تو ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہوگئے، اس لئے ان میں سے اگر کوئی محرومی کے خیال سے غیظ و غضب میں آکر اپنے بھائیوں کی خاطر بلاان کے مشورہ کے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر دادا کی زندگی ہی میں چچا کو

کسی حیلہ سے مار ڈالے تو بالکل قرین قیاس ہے۔ کیونکہ آئے دن مال و دولت کے پیچھے دنیا میں خونریزیاں ہوتی رہتی ہیں، بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ بشرط ثبوت قاتل کو سزا مل جائے گی لیکن اس کے بقیہ تین بھائی جو پہلے بالکل محروم تھے، اب دادا کے ترکہ میں سے تین ثلث کے حصہ دار ہوں گے اور اپنے چچا زاد بھائی سے جو پہلے اپنے باپ کے ذریعہ سے سارے ترکہ کا وارث ہونا تگنا حصہ پائیں گے اس غریب کا باپ بھی مارا گیا اور حصہ بھی صرف ایک چوتھائی رہ گیا۔ اور قاتل کے بھائی جو محجوب تھے اس سے تگنے کا حقدار ہو گئے۔

اس لئے یہ محجوب الارث کا مسئلہ بعض صورتوں میں قتل اور قطع رحم کا بھی محرک ہو سکتا ہے۔

الغرض مسئلہ محجوب الارث میں ظاہری اور باطنی ہر قسم کی خرابی ہے اور یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اسی وجہ سے اہل اسلام اس مسئلہ کو اگرچہ مانتے چلے آتے ہیں لیکن ان کی طبیعتیں اس سے مالوف نہیں ہیں اور عام طور پر ان کے دلوں میں یہ کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔

امید ہے کہ فقہائے اسلام ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلہ پر غور فرمائیں گے اور نہایت کمزور دلائل کی بنیاد پر یتیم اولاد کو خاندانی حقوق سے بلاقصور محروم کرکے اسلام کے مقدس دامن پر یتیموں کے خون کے دھبے نہ ڈالیں گے۔

ہم سے غلطی ہونی ممکن ہے لیکن اسلام دین الٰہی ہے وہ ہر قسم کی غلطیوں سے مبرا اور پاک ہے۔

گر من آلودہ دامنم چہ عجب　　　ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اوست

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

ؔ فقہا بایک درجہ کے ایک قسم کے ورثہ میں ترکہ کو علی الرؤس تقسیم کرتے ہیں، مثلاً زید اگر اپنے چار پوتے چھوڑ کر مر جائے جن میں سے تین ایک بیٹے کے ہوں اور ایک ایک بیٹے کا تو وہ چاروں برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ یہ طرز تقسیم ایسا ہے کہ نہ اس پر قرآن شاہد ہے نہ حدیث، اور عقل کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ وہ تینوں بیٹے اپنے باپ کے قائم مقام ہیں جو زیادہ سے زیادہ نصف کا حصہ دار ہو سکتا تھا۔ پھر اس کے قائم مقام تین ثلث کیونکر پا سکتے ہیں۔ یہاں بھی فقہا نے قائم مقامی کے اصول کو نظر انداز کر دیا۔

قانونِ حجب

(محترم تمنا عمادی صاحب)

[یتیم پوتے کی وراثت سے متعلق مختلف مضامین اشاعتِ سابقہ میں آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ محترم تمنا عمادی نے بھی زیرِ نظر مقالہ میں اپنے مخصوص انداز میں اسی نکتہ کی وضاحت فرمائی ہے کہ یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے کبھی محروم نہیں ہو سکتا۔ یہ بحث فنی ہے اور اس کے مخاطب وہ حضرات ہیں جو قانونِ فرائض کی فقہی بحثوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

ہمیں مقالہ کے بعض جزئی مقامات سے اختلاف ہے لیکن ان اختلافات کا موضوعِ زیرِ نظر پر کچھ اثر نہیں پڑتا اسلئے ہم نے ایک آدھ مقام کے علاوہ ان اختلافات کی وضاحت ضروری نہیں سمجھی۔ اگر "فنِ وراثت" کے متعلق کبھی تفصیلی بحث کی ضرورت پڑی تو ان مقامات کو بھی سامنے لایا جائے گا۔ طلوعِ اسلام]

قرآن مبین میں کہیں بھی وراثت سے محجوب ہونے والے وارثوں کی کوئی تصریح نہیں اور نہ اس کی ضرورت تھی، جبکہ خود فرمادیا کہ للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون (خلاصۂ ترجمہ) باپ ماں اور قریب تر قرابتمندوں نے مرنے کے بعد جو کچھ چھوڑا ہے اس مال متروکہ میں مرد قریب تر وارثوں کیلئے بھی ایک حصہ ہے اور عورت قریب تر وارثوں کیلئے بھی مما قلّ منہ او کثُر وہ حصہ کم ہو یا زیادہ۔ یا وہ مال متروکہ کم ہو یا زیادہ (پہلی صورت میں من بیانیہ ہوگا دوسری صورت میں تبعیضیہ) اور فرمایا گیا و لکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم۔ ہم نے ہر ایک (مرنے والے) کے سلئے ترکے کے حقدار ورثا بنادیے ہیں (وہ کون کون ہیں؟) باپ ماں ہیں، قریب تر قرابتمند ہیں اور وہ ہیں جنھیں تمہارے داہنے ہاتھوں نے گرہ میں باندھ رکھا ہے (یعنی عقد نکاح کے ذریعے) تو ان ورثا کو ان کا حصہ دیدو (ما ترک پر وقف لازم چاہئے اور اس کے بعد "الاقربون" پر وقف صحیح نہیں۔ بلکہ "ایمانکم" پر وقف ہونا چاہئے اور اس سے عہد کے روسے منہ بولے ورثا مراد لینا صحیح نہیں۔ بلکہ یہ آیت جاہلیت کے اسی رواج کو ختم کر رہی ہے کہ ہم نے تو تمہارے ورثا والدین، اقربون اور ازواج کو بنادیا بس انھیں کو ان کے حصے دیدو یعنی پھر اپنی طرف سے منہ بولے وارث بنانے کی کیا ضرورت ہے۔)

غرض والدین و ازواج کے علاوہ اقربون یعنی میت سے زیادہ نزدیک تر وارث جو بھی ہوں ترکہ پانے کے مستحق ہیں۔ اقرب کا لفظ یہ صاف بتا رہا ہے کہ جو زیادہ قریب ہوگا اس کے ہوتے دور کی قرابت والے وارث نہ ہوں گے اسلئے ہر قریب، بعید کا حاجب ہوگا۔ والدین اور ازواج مستقل ورثا ہیں۔ ازواج میں قرب و بعد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مگر والدین میں قرب و بعد کا سوال اسی وقت پیدا ہو جائیگا جب والدین کے والدین بھی ہوں۔ میت کے والدین نہ ہوں مگر اس کے والدین کے والدین ہوں تو وہی اقربین ہوں گے۔ مگر میت کے والدین

بھی ہوں اور والدین کے والدین بھی ہوں تو پھر میت سے قریب تر خاص میت کے والدین ہیں اور اس کے والدین کے والدین بعید ٹھہرے۔ اس اصول نے سمجھا دیا کہ[1] وارث قریب و بعید کے اعتبار میں شرکت فی النسب کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بعید کا خود کوئی حصہ نہ ہو وہ وہی حصہ پائے جو اس سے قریب تر پاتا، اور اس بعید کی قرابت اسی قریب کی وساطت سے میت تک پہنچی ہو۔ فقہا نے اس کو شرطِ حجب قرار دے کر اس کا نام اِدلاء رکھا ہے۔ "ادلاء" کے معنی از روئے لغت خود فقہاء "اتصال، انتساب اور توسل" لکھتے ہیں۔ "ادلاء" کی تعریف طحطاوی سے صاحب ردالمحتار نے اور ان سے محشی شریفیہ نے حاشیہ سے صفحہ ۵۸ میں یوں لکھی ہے: "الادلاء لغۃ ارسال الدلو فی البئر ثم استعمل فی کل شئ یمکن فیہ دلو بطریق المجاز (لغت میں دلی یدلو دَلوًا لکھکر دلو کے معنی استقاء، توسل اور طلب لکھے ہیں) فمعنی یدلی الی المیت یوسل قرابتہ الیہ شخص۔ والباء فیہ للالصاق۔ فالقرابۃ مشترکۃ بین المدلی والواسطۃ۔"

اس عبارت سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ اصطلاحی "ادلاء" جو یہاں حجب کیلئے شرط ہے اس کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ جو قرابت مدلی بہ یعنی واسطہ کو ہو وہی قرابت میت کے ساتھ مدلی کو بھی ہو۔ جیسے باپ اور دادا۔ کہ "ابوۃ" میں دونوں شریک ہیں۔ مگر دادا کی ابوۃ میت تک باپ کے واسطہ سے پہنچتی ہے۔ اور بیٹا اور پوتا کہ بنوۃ میں دونوں شریک ہیں مگر پوتے کی بنوۃ بیٹے کے واسطے سے میت تک پہنچتی ہے۔ جس طرح میت اور میت کے دادا کے درمیان میت کا باپ واسطہ ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح میت اور میت کے پوتے کے درمیان میت کا بیٹا واسطہ ہوتا ہے تو دادا اور پوتے کو مدلی کہیں گے اور باپ اور بیٹے کو مدلی بہ۔ فرق اس قدر دادا اور پوتے اور باپ اور بیٹے میں ضرور ہے کہ کئی باپ اور کئی دادا نہیں ہو سکتے مگر کئی بیٹے اور کئی پوتے ہو سکتے ہیں۔ قرآن مبین سے ادلاء کا اصول باپ ہی کی وراثت سے مستنبط ہوا ہے، اگر باپ کے نہ ہونے پر باپ کا حصہ دادا نہ پاتا اور اَبْ میں دادا بھی شمار نہ کیا جاتا تو پھر بیٹے کے نہ ہونے پر پوتے کی وراثت محض قیاسی ہی رہتی، قرآن سے مستنبط نہ ہوتی۔ اور یہ سمجھا گیا کہ جس طرح اَبْ میں دادا بھی داخل ہے اگر اب نہ ہو تو ابو الاب یعنی دادا ہی اَبْ کی جگہ لے لیگا۔ اسی طرح ولد میں ولد الولد بھی داخل ہے۔ ولد نہ ہو تو ولد الولد اس کی جگہ لے لیں گے۔ فقہا نے یہیں پہ دھوکا کھایا اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ ولد کے ہوتے ولد الولد بعید ہو گیا اس لئے کسی بیٹے کے ہوتے کسی پوتے کو بھی ترکہ نہیں ملنا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ ہاں نہیں ملنا چاہئے۔ مگر اُسی پوتے کو دادا کا ترکہ نہیں ملنا چاہیے جس پوتے کا باپ زندہ ہے، اسلئے کہ دادا اور پوتے کا درمیانی واسطہ موجود ہے۔ واسطہ یعنی مدلی بہ کے ہوتے مدلی یقیناً بعید ہو گیا قریب نہ رہا۔ جیسے باپ کے ہوتے دادا بعید ہوتا ہے۔ مگر جس پوتے اور دادا کے درمیانی واسطہ یعنی مدلی بہ موجود نہ ہو، وہ پوتا کیوں بعید ہونے لگا۔ جس طرح میت اور اس کے دادا کے درمیان جو واسطہ ہو سکتا تھا وہ میت کا باپ تھا۔ میت کے باپ کے نہ ہونے کی صورت میں میت کا دادا میت کے چچا کی وجہ سے محجوب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میت اور میت کے دادا کے درمیان میت کا چچا کوئی حیثیت توسط نہیں رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح میت اور میت کے پوتے کے درمیان واسطہ میت کا وہی بیٹا تھا جو اُس کے اِس پوتے کا باپ تھا۔ جب اس پوتے کا باپ نہ رہا تو میت اور اُس کے اِس پوتے کے درمیان اِس پوتے کا چچا بھی اسی طرح کوئی حیثیت توسط نہیں رکھتا۔ تو جب میت کا چچا میت کے دادا کو محجوب نہیں کر سکتا تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس پوتے کے چچا اس پوتے کو اپنے

---

[1] قرآن مجید سے مستنبط اصول حجب۔

میت دادا کے ترکہ سے محروم کردیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ مورث کا چچا وارث کو محجوب نہیں کرسکتا۔ مگر وارث کا چچا وارث کو محجوب کرسکتا ہے۔ وارث کے چچا کا قیاس مورث کے چچا پر صحیح نہیں۔ ایسا نہیں کہا جا سکتا کیونکہ چچا اور بھتیجے میں کوئی تعلق بلاواسطہ نہیں ہوتا اور بالواسطہ تعلق والا جو اپنے تعلق میں خود ایک واسطے کا محتاج ہے اتنی قوت نہیں رکھتا کہ جس سے بالواسطہ تعلق حاصل کرتا ہو، اس کا حاجب ہوجائے۔ اور پھر اس طرح کی باتیں ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب وارث کا بیٹا وارث کو محجوب نہیں کرسکتا تو مورث کا بیٹا وارث کو کیوں محجوب کرنے لگا؟ مگر اس طرح کے منطقی مغالطہ آمیز دلائل کی یہاں گنجائش ہی نہیں کیونکہ یہ مسئلہ محض قیاس پر مبنی رہا ہی نہیں۔ اس کی بنیاد جب ایک ایسے اصول پر خود فقہاء رکھ چکے ہیں جو قرآن مبین سے مستنبط ہے اور وہ میزان کا متفق علیہ اصول ہے۔

فتعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم! آپ شرائط حجب میں پہلی شرط ادلاء بیان کرچکے۔ اور مدلی اور مدلی بہ میں شرکت فی القرابت ضرور قرار دے چکے ہیں۔ بدلی الی المیت کے معنی خود لکھ چکے ہیں کہ یرسل قرابتہ الیہ بہ مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی نے اس کو اور بھی واضح فرما دیا اور شریفیہ کے ص۱۲ و ۱۳ میں حاشیہ ۱ میں صحیح تحریر فرمایا کہ واما الادلاء فانما یکون سببا للحجب لاجل المشارکۃ بین المدلی والمدلی بہ فی النصیب بان یکون المدلی شریکا فی نصیب المدلی بہ یعنی مدلی اور مدلی بہ میں جب تک اشتراک فی النصیب بھی نہ ہو صرف اشتراک فی القرابۃ کی وجہ سے ادلاء سبب حجب نہیں ہوسکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ فقہا اور مولانا عبدالحی رحمہم اللہ یہ لوگ اپنے مفہوم کو پوری طرح ادا نہ کرسکے۔ اشتراک فی القرابۃ تو صحیح ہے مگر اشتراک فی النصیب کہنا صحیح نہیں بلکہ کہنا چاہئے استحقاق النصیب بالنیابۃ یعنی مدلی حصے کا مستحق ٹھہرے مدلی کی نیابت میں۔ اور ظاہر ہے کہ نیابت جبھی ہوگی کہ منیب موجود نہ ہو۔ منیب کے ہوتے نائب مستحق نہیں ہوسکتا۔ منیب نہ ہوگا تو نائب بیشک مستحق ہوجائے گا۔ چنانچہ مولانا عبدالحیؒ نے اس مفہوم کو خود ادا فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مدلی کا بذاتِ خود کوئی حصہ نہیں بلکہ مدلی بہ ہی کے حصے کو وہ مدلی بہ کے نہ ہونے کی وجہ سے پاتا ہے تو استحقاق بالنیابۃ ہوا نہ کہ اشتراک فی النصیب۔ اشتراک فی النصیب کیلئے ضروری ہے کہ دونوں شریک بیک وقت موجود ہوں، ورنہ مورث و وارث دونوں کو شریک فی المال کہنا صحیح ہونا چاہئے۔ اب آپ دیکھئے پدرِ میت کے ہوتے جدِ میت کا کوئی حصہ نہیں مگر پدرِ میت نہ ہو تو جدِ میت پدرِ میت کا نائب و قائم مقام ہوکر پدرِ میت کا حصہ لے لیتا ہے۔ اسی طرح پسرِ میت کے ہوتے حفید یعنی نبیرۂ میت (میت کا پوتا) کسی حصے کا بھی مستحق نہیں۔ مگر پسرِ میت نہ ہو تو نبیرۂ میت اپنے باپ کا نائب و قائم مقام ہوکر اس کا حصہ لے گا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس دادا پوتے کے درمیان اس پوتے کے چچا آ جائیں اور اس کو وہ محجوب کردے۔ یہ پوتا مدلی ضرور ہے مگر اس کا مدلی بہ اس کا باپ تھا جو مر گیا۔ اس کا چچا اس کا مدلی بہ جب نہیں ہے تو پھر غیر مدلی بہ چچا اس کا حاجب کس طرح ہوسکتا ہے؟ فقہاء خود اس اشتراک کے لفظ کو لکھ کر پھر کچھ گھبرائے اس لئے اشتراک قرابت و اشتراک نصیب کی جگہ پھر صرف "اتحادِ سببِ ارث" لکھنے لگے۔

مگر جب ہمارے فقہا نے دیکھا کہ یہ تو ایسا خراب اصولِ حجب بنا کہ اب نہ یتیم پوتے کو اس کے چچا کی وجہ سے دادا کے محجوب و محروم کیا جاسکے گا، نہ بھائی بہن کو باپ کی وجہ سے محروم بھائی کے ترکہ سے محروم کیا جاسکتا ہے۔ تو فوراً خود اپنے بنائے ہوئے قرآن مبین سے مستنبط اصول کو توڑ ڈالا اور تحریر فرماتے ہیں کہ ثم نقول ھھنا معنیان اتحاد السبب والادلاء۔ ولکل منھما تاثیر فی الحجب۔ فکما ان

اتحاد السبب اذا انفرد عن الادلاء تعلق به حکم الحجب، کذلك اذا انفرد الادلاء عنه ثبت به الحجب ایضاً۔ یعنی ہم کہتے ہیں کہ یہاں دو معنی ہیں۔ ایک تو اتحادِ سببِ ارث، دوسرے ادلاء۔ اور ان میں سے ہر ایک کا کسی وارث کو محجوب کرنے میں ایک مستقل اثر ہے تو جس طرح اتحادِ سببِ ارث اگر ادلاء سے خالی ہو، جب بھی اس کی وجہ سے حجب کا حکم کسی وارث کے متعلق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ادلاء اگر اتحادِ سببِ ارث سے خالی ہو تو اس سے بھی حجب ثابت ہو سکتا ہے (شریفیہ ص۴۱) مگر یہ دونوں معنی کہاں سے پیدا ہوئے؟ ان کا کون سا ماخذ ہے؟ کہاں سے استنباط کیا؟ کچھ نہ لکھا، اور نہ کوئی بتا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اشتراک فی القرابۃ اور استحقاق نصیب بالنیابۃ اصل سبب حجب ہے اور ادلاء اس کی لازمی شرط ہے۔ بغیر ادلاء کے صرف اشتراک فی القرابۃ حاصل ہے اور اتحاد نصیب بھی مگر ادلاء اور استحقاق بالنیابۃ نہیں ہے اسلئے ایک بیٹا دوسرے بیٹے کا اور ایک بیٹی دوسری بیٹی کی حاجب نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح صرف ادلاء بھی سبب حجب نہیں ہو سکتا ورنہ احد الزوجین کو اولاد کا حاجب ہونا چاہئے کیونکہ احد الزوجین (شوہر یا بیوی) اولاد کے لئے مدلی بہ اور واسطۂ قرابت ہیں۔ چنانچہ امام الفرائض سید شریف جرجانی شریفیہ میں تحریر فرماتے ہیں: فان المدلی به حینئذ یاخذ نصیبه المستند الی سببه والمدلی یاخذ نصیبا اٰخر مستند الی سبب اٰخر۔ فلا حرمان۔ کما فی الام واولادہ۔ یعنی ایسی صورت میں مدلی بہ اپنا ذاتی حصہ پاتا ہے جو اس کے اپنے خاص سبب ارث کی وجہ سے ملتا ہے، اور مدلی اپنا حصہ ایک دوسرا پاتا ہے جو پہلے حصے کا مغائر ہے۔ اسی لئے ایک کی وجہ سے دوسرے کو وراثت سے محرومی نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ ماں اور اس کی اولاد کے درمیان باوجود ادلاء کے اولاد محروم عن الارث نہیں ہوتی۔ تو پھر کوئی بتلائے کہ یہی صورت تو باپ اور باپ کی اولاد کے درمیان بھی ہے۔ پھر باپ کی وجہ سے باپ کی اولاد کیوں محروم قرار دی جاتی ہے؟ بَیِّنُوْا تُؤْجَرُوْا!

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

کمال تو یہ ہے کہ شریفیہ کے اسی صفحہ ۴۱ پر جس میں صاحب شریفیہ نے دو عجیب و غریب معنی لکھے ہیں باوجود امام الفرائض ہونے کے کہ اتحاد سبب بغیر ادلاء کے اور ادلاء بغیر اتحاد سبب کے بھی موجب حجب ہو سکتا ہے مولانا عبد الحی حاشیہ ۱۱ صفحہ ۴۱ و ۴۲ میں لکھتے ہیں کہ ومحصول الحاصل ان الادلاء انما یوجب الحجب اذا کان المدلی به عصبة مستحقا لجمیع المال او اتحد فی سبب الارث کما ان ام الام تسقط لوجود الام۔ وابو الاب یسقط لوجود الاب۔ لان سبب الارث هو الامومة والابوة۔ فثبت ان الادلاء مطلقا لیس سببا للحجب بالحرمان بل الادلاء الخاص سبب له۔ یعنی خلاصہ کلام یہ ہے کہ ادلاء سبب حجب جبھی ہوگا کہ مدلی بہ عصبہ مستحق جمیع مال کا ہو، یا مدلی بہ اور مدلی دونوں سبب ارث میں متحد ہوں جیسا کہ نانی ماں کے ہوتے محروم ہو جاتی ہے اور دادا باپ کے ہوتے محروم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سبب ارث وہی ماں ہونا اور باپ ہونا ہے۔ (یعنی ماں ہونا، ماں اور نانی میں مشترک ہے۔ اور باپ ہونا، باپ اور دادا میں مشترک ہے) تو ثابت ہوا کہ مطلق ادلاء حجب حرمان کا سبب نہیں ہے بلکہ خاص ادلاء اس کا سبب ہے۔

اس حاشیہ میں اس کا پتہ ملا کہ باپ کو بھائی بہن کا حاجب قرار دینے کیلئے ایک قید اور بڑھائی گئی یعنی مدلیٰ بہ کا عصبہ مستحق جمیع مال ہونا یعنی جب جیسی ضرورت پیش آئی ایک قید بڑھادی گئی۔ چاہے کسی نص قطعی پر مبنی ہو یا نہ ہو۔ حالانکہ ہر عصبہ مستحق جمیع مال ہوجاتا ہے اگر کوئی دوسرا وارث نہ ہو۔ ورنہ دوسرے ورثار سے جو باقی بچے گا وہی وہ پائے گا۔ عصبہ کسی وارث کا بھی حاجب نہیں ہوسکتا اور یہ وہ باتیں ہیں جن سے کوئی فرائض جاننے والا انکار نہیں کرسکتا۔ اور اگر صرف مستحق جمیع مال ہوجانے کی وجہ سے صرف ادلار بغیر اتحاد سبب ارث کے موجب حجب ہوسکتا ہے تو ماں بھی بعض وقت مستحق مال ہوجاتی ہے

ہمارے فقہار نے پہلے اس کو سوچ لیا کہ کس کس کو کس کس کا حاجب بنانا ہے۔ اس کے بعد اس کے لئے اصول بنانے بیٹھے تو ایک اصول بنایا، کسی جگہ وہ کام دیتا نظر نہ آیا تو ایک قید بڑھادی۔ تیسری جگہ پھر دشواری پڑی تو پھر ایک اور قید کا اضافہ کیا۔ کہیں علیٰ سبیل الاجتماع، کہیں علیٰ سبیل البدلیت۔ یعنی کہیں چند شرطوں میں سے ہر ایک کا پایا جانا ضروری قرار دیا گیا، کہیں یہ کہ یا یہ ہو یا وہ۔ (باپ کو بھائی بہن کے حاجب بنانے کی کوشش صرف کلالہ کے صحیح معنی نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے فقہا کرتے رہے، جس کی بنیاد ابو جعفر بن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں رکھی اور پھر سارے فقہار و مفسرین اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ میں اس کی بحث آگے کرونگا ابھی شرائط حجب کی بحث جو باقی رہ گئی ہے اس کو ختم کرلینا ضروری ہے۔)

مگر حقیقت یہ ہے کہ باپ ہو یا ماں، لغت کے اعتبار سے یہ مدلیٰ بہ اور بھائی بہن مدلیٰ ضرور ہوجاتے ہیں اسلئے کہ بھائی بہن سے میت کو قرابت والدین ہی کے واسطے سے ہوتی ہے۔ مگر یہ اصطلاحی ادلار نہیں ہے جو سبب حجب ہوسکے۔ میں امام طحطاوی کی تحریر ردالمحتار کی تصدیق، اور محشی شریفیہ کی توثیق سے یہ ثابت کرچکا ہوں کہ جو ادلار سبب حجب ہے اس کیلئے مدلیٰ بہ اور مدلیٰ کے درمیان اشتراک فی القرابۃ ضروری ہے اور باپ ماں اور بھائی بہن کے درمیان اشتراک فی القرابۃ نہیں ہے۔ دونوں کی قرابتیں دو طرح کی ہیں۔ پھر اشتراک فی القرابۃ کو بدل کر یا اس کے ساتھ اشتراک فی النصیب کا لفظ رکھا گیا۔ پھر بھی بعض جگہ حجب کی گاڑی چلنے سے رہ گئی۔ تو پھر حجب کیلئے ایک دوسری اصل ٹھہرائی گئی۔

اصل دوم اصول حجب میں پہلی اصل ادلاء کا حال تو آپ ملاحظہ فرماچکے۔ دوسری اصل الاقرب فالاقرب کی ہے۔ یہ بھی قرآن مبین ہی کے لفظ الاقربون سے مستنبط ہے۔ یعنی قریب ترکے ہوتے صرف قریب، ترکہ نہیں پاسکتا، اسلئے ہر قریب اپنے سے بعید کا حاجب ہوگا۔ فقہار عام عصبات میں تو اس اصول کو مطلقاً مانتے ہیں۔ مگر ذوی الفروض میں اور ذوی الارحام میں بھی اس اصل کو مشروط باتحاد سبب ارث قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ شریفیہ میں قد مرفی باب العصبات انھم یرجحون بقرب الدرجۃ فالاقرب منھم یحجب الابعد حجب حرمان سواء اتحدا فی السبب ادلاء۔ ھذا جار فی غیرھم ایضا۔ لکن اذا کان ھناک اتحاد السبب۔ یعنی عصبہ کے بیان میں یہ لکھا جاچکا ہے کہ ان میں قرب درجہ کی وجہ سے ترجیح دی جاتی ہے تو جو قریب تر ہوتا ہے وہ بعید کو محجوب کردیتا ہے بالکل محروم قرار دے کر چاہے وہ قریب و بعید سبب ارث میں متحد ہوں یا نہ ہوں۔ اور یہ اصول غیر عصبہ میں بھی جاری ہے۔ لیکن غیر عصبہ میں اتحاد سبب ارث بھی ہو جب۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ عصبات میں بھی اتحاد سبب ارث ہی کی وجہ سے ایک عصبہ دوسرے کو محجوب و محروم کرتا ہے۔ کیونکہ عصبات میں سبب ارث صرف عصوبۃ ہے یعنی عصبہ ہونا۔ اور اس میں قریب و بعید یعنی حاجب و محجوب دونوں شریک ہوتے ہیں۔ عصبہ کا کوئی حصہ معین ہوتا ہی نہیں کہ اتحاد یا اشتراک فی النصیب کا سوال یہاں پیدا ہو۔ باقی رہا اشتراک فی القرابۃ تو ادلاء کے ساتھ بھی الاقرب فالاقرب کا اصول موجب حجب ہوگا۔ جیسے باپ کے ہوتے دادا اور چچا کے ہوتے چچیرے بھائی محروم و محجوب ہوں گے۔ اگر ادلاء نہ ہو تو صرف قرب و بعد اشتراک قرابت عمومی و اشتراک عصوبت کی وجہ سے موجب حجب ہوگا۔ جیسے باپ کے ہوتے چچا یا چچیرے بھائی محجوب ہوتے ہیں۔

ایک عجیب بات

قرآن مبین سے جو الاقرب فالاقرب کا اصول مستنبط ہوتا ہے تو قریب تر رشتہ دار کو ان کے مورث کے مال میں سے حصہ دلوانے کیلئے۔ مگر ہمارے فقہا نے الاقرب فالاقرب کا اصول قائم کیا ہے وارث بعید کو محجوب و محروم کرنے کے لئے۔ بات تو بظاہر دونوں ایک ہی معلوم ہوتی ہے مگر نیت کے فرق کی وجہ سے طریق غور و تدبر اور اس کے نتائج میں تفاوت پیدا ہو کر رہا۔ الاقرب فالاقرب کے معنی تو یہ ہیں کہ الاقرب یستحق ثم الاقرب نہ کہ الاقرب یحجب ثم الاقرب۔ اور یہ ترکیب الٹی گئی ہے فحوائے قرآن مبین کے خلاف صرف یتیم پوتے کو اس کے دادا کے ترکہ سے چچا کی وجہ سے محجوب و محروم کرنے کیلئے۔ چنانچہ خود سید شریف جرجانی شارح سراجیہ تحریر فرماتے ہیں۔ وانما لم یکتف المصنف بالاصل الاول لئلا یتوہم ان ولد الابن ذکرا کان او انثی یرث مع الابن الذی لیس بابیہ فانہ لا یدلی بہ یعنی صاحب سراجیہ نے اصل اول پر اکتفا نہ کی تاکہ اس کا گمان نہ ہو کہ پوتا یا پوتی اپنے چچا کے ہوتے دادا کے وارث ہو سکتے ہیں، کیونکہ چچا ان کا مدلی بہ نہیں ہے۔ اس پر مولانا عبدالحی لکھنوی حاشیہ میں لکھتے ہیں، و وجہ الوہم لان الاصل الاول للحجب منتف ھھنا لان ولد الابن (المتوفی) لیس بمدلی بھذا الابن (الحی) فلما ذکر الاصل الثانی ایضا اندفع (ای ذلک الوہم) لان فی الصورۃ المذکورۃ وان لم یوجد الاصل الاول لکن الاصل الثانی موجود البتہ۔ فحجب ابن الابن (المتوفی) بالابن الآخر (الحی) لقربہ منہ۔ یعنی جس وہم سے سید شریف جرجانی اور ان سے پہلے صاحب سراجیہ ڈرے تھے وہ وہم اس طرح پیدا ہوتا تھا کہ حجب کی پہلی اصل یعنی ادلاء پوتے اور اس کے چچا کے درمیان نہیں ہے کیونکہ اس پوتے کی قرابت میت کے ساتھ اپنے متوفی باپ کے واسطے سے قائم ہے نہ کہ اپنے چچا کے واسطے سے۔ اس لئے چچا مدلی بہ نہ ہوا اور جب مدلی بہ نہ ہوا تو وہ حاجب بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ حاجب وہی ہو سکتا ہے جو مدلی بہ ہو، اور اس مدلی بہ کے ہوتے وہی محجوب ہوگا جو اس مدلی بہ کا مدلی ہو۔ اسلئے چچا اپنے یتیم بھتیجے کو اس کے دادا کے ترکے سے محروم نہیں کر سکتا۔ مگر جب دوسری اصل بھی قائم کر لی گئی الاقرب فالاقرب والی تو اس کے رو سے چچا اپنے یتیم بھتیجے کو اس کے دادا کے ترکہ سے محروم کر دے گا کیونکہ میت سے قریب تر بیٹا ہے، اور بیٹے کے مقابل پوتا بعید ہے اور اس دوسری اصل میں ادلاء کی قید نہیں لگی ہوئی ہے، صرف اتحاد سبب ارث کی شرط لگی ہے۔ اور اتحاد سبب ارث یعنی بنوۃ (ابن ہونا) بیٹے اور پوتے دونوں میں موجود ہے۔ پوتا بھی چونکہ ابن الابن ہے اس لئے ابن ہی ہے۔ مولانا عبدالحی کے حاشیے کا یہی مطلب ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ قرآن مجید سے جو الاقرب

یستحق الارث فالاقرب کا اصول مستنبط ہوتا ہے اس کو الٹ کر الاقرب یحجب الابعد فالاقرب بنایا گیا صرف یتیم پوتوں کو دادا کے ترکے سے محجوب کرنے کے لئے۔

گمراہ کن اصول

یہ کتنا گمراہ کن اصول ہے کہ پہلے چند مسائل اپنے ذہن میں طے کرلیں کہ ان کے یہ جوابات ہونے چاہئیں اور ان کے جوابوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ناپ ناپ کر اصول بنائے جائیں اور اس کے بعد کہہ دیا جائے کہ ان اصول کے ماتحت یہ جوابات ان مسائل کے ہیں اور وہ اصول بھی تمام قیود کے ساتھ پہلے نہ بنائے جائیں۔ بلکہ جب ایک نئی ضرورت پیش آئے ایک قید بڑھادی جائے۔

ایک ہی اصل پر اکتفا کیوں نہ کی؟

سراج الملۃ والدین محمد بن عبدالرشید السجاوندی نے سراجیہ میں مسئلہ حجب کی بنیاد دو اصلوں پر رکھی ہے۔ ادلاء اور الاقرب فالاقرب۔ صرف اصل اول پر اکتفاء کیوں نہ کی؟ اس کی وجہ سراجیہ کے شارح شریفیہ والے علامہ سید شریف جرجانی کی زبانی ابھی آپ سن چکے۔ کہ اصل دوم صرف اسلئے قائم کی گئی کہ یتیم پوتے اپنے دادا کے ترکے سے چچا کی وجہ سے محجوب کردیئے جاسکیں۔ بس اسی ایک ضرورت نے اصل دوم قائم کرنے پر مجبور کیا۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ توپھر اصل دوم ہی پر اکتفا کیوں نہ کی تو اس کی وجہ بھی خود تحریر فرماتے ہیں: لئلا یتوھم ان ام الام لاترث مع الاب ھکذا قیل - وفیہ نظر. لان الاصل الثانی ان اجری مھنا علی ظاھرہ وھوان الاقرب فی الدرجۃ مطلقاً یحجب الابعد لزم منہ حجب ام الام بالاب وحجب ابن الاخ لاب وام بالاخ لام - وان قید بان یکون الابعد مدلیا بالاقرب کان الاصل الثانی بعینہ الاصل الاول فلا معنیٰ لجعلھما اصلین - وکان الوھم لازماً وھوان ولاد الابن (المتوفی) یرثون مع الابن (الحی) لیس اباھم. یعنی اصل دوم پر اسلئے اکتفا نہ کی کہ کہیں یہ وہم نہ پیدا ہوجائے کہ باپ کے ہوتے نانی محجوب ومحروم ہے۔ اسی طرح بات بتائی گئی ہے مگر یہ محل نظر ہے کیونکہ اصل ثانی اگر اپنے ظاہری مفہوم پر جاری کی گئی کہ جو درجۂ وراثت میں مطلقاً قریب ہو وہ بعید کو محجوب ومحروم کردیگا۔ تو اس سے لازم آئیگا کہ نانی کو باپ محجوب کردے اور عینی بھائی کے بیٹے کو اخیافی بھائی محجوب کردے اور ایسا ہے نہیں۔

اور اگر اس اصل دوم میں بھی ادلاء کی قید لگا کر کہا جائے کہ بعید مدلی ہو اور قریب مدلی بہ جب قریب بعید کو محجوب کردے گا توپھر اصل ثانی بعینہ اصل اول ہوجاتی ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں رہتا، اسلئے پھر دو اصلیں قائم کرنا بے سود ہوجاتا ہے۔ اور سب سے بڑی دشواری یہ پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ پہلا وہم جس کو دور کرنے کے لئے یہ اصل دوم بنائی گئی تھی پھر خطرہ بن کر سامنے آجاتا ہے یعنی جب تو یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے اس کے محجوب ومحروم نہ کرسکیں گے۔ کیونکہ چچا اپنے یتیم بھتیجوں کے مدلی بہ نہیں ہیں۔ اور یہ برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

صاحب شریفیہ نے جو فیہ نظر لکھا ہے اس پر مولانا عبدالحی مرحوم حاشیہ ۵ صفحہ ۵۹ میں تحریر فرماتے ہیں۔ وحاصل الایراد المصدر بقولہ فیہ نظر: ان الاصل ان اجری علی ما یستفاد ظاھرا وھوان الابعد یکون محجوبا بالاقرب سواء

کان مدلیا بالاقرب اولا فیلزم حجب ام الام بالاب لانها ابعد منہ البتۃ وان لم تکن مدلۃ بھا۔ وحجب ابن الاخ العینی بالاخ الاخیافی، لان الاول ابعد من الثانی وان لم یکن مدلیا بہ۔ وان ارید ان الابعد المدلی یحجب بالاقرب المدلی بہ یکون ھذا الاصل عین الاصل الاول معنی۔ وتتمۃ الایراد انہ ان ارید ان الابعد الغیر المدلی یحجب بالاقرب الغیر المدلی بہ یلزم منہ ما یلزم علی الاول۔ وان ارید ما سواہ فیجب ان یبین۔ یعنی سید شریف نے شریفیہ میں " فیہ نظر" لکھکر جو اعتراض کیا ہے اس اعتراض کا ماحصل یہ ہے کہ یہ اصل دوم اگر اپنے ظاہری معنی میں لیا گیا کہ بعید قریب کی وجہ سے محجوب ہوجائے گا چاہے بعید مدلی اور قریب مدلی بہ ہو یا نہ ہو، تو اس سے یہ لازم آجائے گا کہ نانی باپ کی وجہ سے محروم ہوجائے کیونکہ باپ کے مقابل ماں کی ماں ضرور بعید ہے۔ اگرچہ نانی مدلی اور باپ مدلی بہ نہیں ہے۔ اسی طرح عینی بھائی کا لڑکا اخیافی بھائی کے مقابل محجوب ہوجائیگا کیونکہ بھائی کے مقابل بھتیجا ضرور بعید ہے اگرچہ یہ بھتیجا جو عینی بھائی کا بیٹا ہے، اخیافی بھائی کا مدلی، اور اخیافی بھائی اس کا مدلی بہ نہیں ہے۔

اور اگر الاقرب فالاقرب سے یہ مراد ہے کہ بعید مدلی محجوب ہوجاتا ہے قریب مدلی بہ کی وجہ سے؟ تو یہ اصل دوم بالکل وہی اصل اول معنوی اعتبار سے ہوجاتی ہے۔ اور اس اعتراض کا تتمہ یہ ہے کہ اگر الاقرب فالاقرب سے یہ مراد ہے کہ بعید غیر مدلی، قریب غیر مدلی بہ کی وجہ سے محجوب ہوتا ہے، تو اس سے وہی بات لازم آجاتی ہے جو پہلی اصل سے لازم آتی ہے اور اگر اس کے سوا کچھ اور معنی الاقرب فالاقرب کے ہیں تو اس کا بیان کرنا واجب ہے۔

مولانا عبدالحی صاحب رحمہ اللہ کا خلاصہ مطلب یہ ہے اور یہی مطلب صاحب شریفیہ کا بھی ہے کہ اگر اصل دوم الاقرب فالاقرب میں ادلاء کی قید بھی ضروری ہے تو پھر یہ اصل بیکار ہے صرف پہلی ہی اصل کافی ہے۔ اور اگر بغیر ادلاء کے صرف درجہ رشتہ مندی میں قرب و بُعد مقصود ہے تو پھر دوسری دشواریاں پیدا ہوجاتی ہیں یعنی باپ کی وجہ سے نانی اور اخیافی بھائی کی وجہ سے عینی بھائی کا لڑکا بھی محجوب ہوجاتا ہے اور ہم فقہاء صرف یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے چچا کی وجہ سے محروم کرنا چاہتے ہیں، اور ایسی کوئی صورت نکلتی نہیں جس سے صرف یہی یتیم پوتے محروم ہوں اور دوسرے جائز وارث محروم نہ ہوں، کیونکہ صورت دو ہی ہیں۔ اقرب و ابعد کے درمیان ادلاء ہو یا نہ ہو، اگر ہو تو یہ پہلی اصل ہوجاتی ہے اور چونکہ یتیم بھتیجے اور چچا کے درمیان ادلاء نہیں ہے اس لئے یتیم بھتیجا اپنے چچا کی وجہ سے محجوب نہیں ہوسکتا۔ اور اگر بغیر ادلاء کے ہر قریب اپنے سے بعید کو محجوب و محروم کردے، یہ معنی لئے جائیں تو یتیم بھتیجا اپنے چچا کی وجہ سے محجوب تو ہوجاتا ہے مگر دشواری یہ آپڑتی ہے کہ پھر باپ کی وجہ سے نانی بھی محجوب ہوجاتی ہے اور اخیافی بھائی کی وجہ سے عینی بھائی کا لڑکا بھی محجوب ہوجاتا ہے اور یہ ایسی دھرتی ہے جو اٹھائی نہیں جاتی۔ اور اگر کوئی تیسری شکل ایسی ہے جس سے صرف یتیم پوتا ہی اپنے دادا کے ترکہ سے چچا کی وجہ سے محجوب کردیا جاسکے تو مولانا عبدالحیؒ فرماتے ہیں کہ فیجب ان یبین یعنی واجب ہے کہ وہ صورت بیان کی جائے۔ مگر یہ نہیں لکھا کہ کس پر واجب ہے؟ اور اس واجب کو کون ادا کرے گا؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ قیامت تک یہ واجب الاداء قرض ہمارے فقہاء غفر اللہ لہم پر یوں ہی رہ جائیگا اور کبھی ادا نہ ہوگا۔

یتیم پوتے ناتی غرض فقہا نے جو حجب کی دو اصلیں لکھی ہیں ان دونوں اصلوں میں سے کسی اصل کے رو سے بھی یتیم پوتے اپنے دادا کے اور یتیم ناتی اپنے نانا کے ترکے سے کبھی محروم نہیں ہو سکتے۔

آخر فقہا کو یتیموں سے کیوں عداوت ہوگئی؟ عداوت تو نہیں مگر غلط فہمی ضرور ہوئی اور یہ غلط فہمی دراصل ابن جریر ابو جعفر الطبری صاحب التفسیر کی پیدا کردہ ہے۔ یعنی ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں کلالہ کے معنی یہ لکھے کہ من لا ولد لہ ولا والد یعنی جس کے نہ والد ہو نہ ولد وہی کلالہ ہے۔ اور پھر ایک دشواری ان کی نظر کے سامنے اور بھی تھی وہ یہ کہ کلالہ ہی کے وارثوں میں بھائی بہن کے حصے دو جگہ مذکور ہیں۔ ایک تو سورۂ نساء کے دوسرے رکوع میں جس میں پورا قانون وراثت تفصیل درج ہے۔ یہاں صرف ایک بھائی یا بہن ہو تو اس کو چھٹا حصہ ورنہ ایک سے زیادہ ہوں تو دو سدس یعنی تیسرا حصہ دلوایا ہے۔ اور پھر آخر سورۂ نساء میں یعنی اس سورہ کی ایک سو چھہترویں آیت میں جب لوگوں نے کلالہ کے بھائی بہن کا حصہ دریافت کیا ہے تو بھائی بہن کو بالکل اپنی اولاد کی طرح حصے دلوائے ہیں یعنی صرف ایک بہن ہو تو اس کو صرف ایک بیٹی کی طرح نصف دلوایا، دو یا دو سے زیادہ بیٹیوں کی طرح بہنیں بھی اگر دو یا دو سے زیادہ ہوں تو انھیں دو ثلث دیئے گئے اور بھائی بہن مخلوط ہوں تو بیٹا بیٹی مخلوط کی طرح مرد کو دو عورتوں کے برابر کے حساب سے ملے گا۔ یوں ہی بتایا گیا ہے۔ مفسرین اور فقہا بہت گھبرائے کہ مورث کلالہ کا ذکر دونوں جگہ ہے اور دونوں جگہ کلالہ کے وارث بھائی بہن ہی ہیں مگر ایک جگہ ایک ہو تو صرف ایک سدس ملتا ہے بھائی ہو یا بہن، اور دوسری جگہ کلالہ ہی کے بھائی ہی صرف ہو تو پورا مال، صرف ایک بہن ہو تو نصف مال ایک سے زیادہ صرف بہنیں ہوں تو دو ثلث بھائی بہن مخلوط ہوں تو للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق سارا مال وہی سب لے لیتے ہیں۔ اس کی کوئی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔

امام رازی تفسیر کبیر میں سورۂ نساء کے دوسرے رکوع کی تفسیر لکھتے ہوئے جب وَان کان رجل یورث کللۃ او امراۃ ولہ اخ الایہ پر پہنچے ہیں تو لکھتے ہیں کہ مفسرین کا اجماع ہے کہ یہاں اَخٌ اور اَوْ اخت سے اخیافی یعنی ماں کی طرف سے اپنے اور باپ کی طرف سے سوتیلے بھائی بہن مراد ہیں جن کی ماں ایک ہو اور باپ دو۔ اور اس اجماع مفسرین کو صحیح ثابت کرنے کیلئے حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کی قرات بھی سند میں پیش کردی کہ وہ سارے صحابہؓ کے اجماع کے خلاف اس آیت میں ولہ اخ کے بعد من ام اور پھر اَوْ اُختٌ کے بعد بھی غالباً مِنْ اُمٍّ کے اضافے کے ساتھ پڑھتے تھے۔

یہ روایت صرف ابن جریر طبری کی من گھڑت ہے جس کو انھوں نے یعلی بن عطاء عن القاسم بن ربیعہ بن عائش عن سعد کرکے روایت کی ہے۔ یہ ہے تو ایک ہی روایت۔ مگر چار طریقوں سے روایت کرکے بزعم خود تعدد طرق بھی دکھلا دیا ہے۔ اگر ابن جریر کی من گھڑت یہ روایت نہیں ہے تو یعلی بن عطاء کا خود ساختہ عطیہ ضرور ہے۔ اگر ابن جریر طبری کو ائمہ رجال نے شیعہ لکھا ہے اور حافظ سلیمانی نے کان

لہ یتیم طفل بے پدر کو کہتے ہیں۔ طفل بے مادر پر یتیم کا اطلاق مجازاً ہیں نے پوتے کے ساتھ ناتی کے لئے بھی کردیا ہے۔ اس کا اطلاق جواری سمجھئے۔ بعض لوگ طفل بے مادر کو "یسیر" کہتے ہیں۔

یضع للروافض یعنی یہ رافضیوں کیلئے حدیثیں گھڑا کرتے ہیں۔ لکھا ہے تو یعلی بن عطا کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں ان کا بھی ترجمہ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ امام فن رجال علی بن المدینی یعلی بن عطار کے متعلق لکھتے ہیں کہ لہ احادیث لم یروها شیوخ ورجال لم یروعنهم غیره واهل الحجاز لایعرفونه۔ یروی عنه قوم لواسط۔ یعنی ان کی بعض خاص حدیثیں ایسی ہیں جن کی روایت ان کے سوا کوئی بھی نہیں کرتا، اور کچھ ایسے شیوخ بھی ہیں جن سے ان کے سوا کوئی بھی روایت نہیں کرتا۔ اور اہلِ حجاز ان کو بالکل نہیں پہچانتے۔ واسط کے کچھ لوگ ان سے روایت کیا کرتے ہیں۔ ابن جریر نے یعلی بن عطار سے جو چار طرق سے روایت کی ہے ان میں تین طرق میں قرارت کی تصریح نہیں ہے۔ بلکہ ولہ اخ کی تفسیر میں سعدؓ کا لامہ بتانا مذکور ہے۔ مگر چوتھی روایت جس میں خود سعدؓ کا ولہ اخ کے بعد من امہٖ کا لفظ پڑھنا مذکور ہے وہ روایت واسطی کے ایک شخص ہشیم بن بشیر الواسطی سے مروی ہے جو مشہور مُدلّس تھے یعنی راویوں کے ناموں میں اور متن حدیث میں الٹ پلٹ قصداً کیا کرتے تھے۔ اسی لئے بعض ائمہ حدیث نے صاف لکھ دیا ہے کہ التدلیس کذبٌ یعنی تدلیس، کذب ہی کا ایک دوسرا نام ہے۔ ان چاروں طرق سے جو یہ ایک روایت ابن جریر نے یعلی بن عطار کی لکھی ہے۔ قاسم بن ربیعہ بن عائش سے مروی ہے انھوں نے حضرت سعدؓ کو غالباً دیکھا بھی نہ ہوگا۔ ان سے کچھ سنا کہاں تک ہوگا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کی وفات ۵۵ھ میں کوئی لکھتا ہے، کوئی ۵۴ھ میں اور کسی نے ۵۸ھ میں لکھا ہے باقی اقوال کو خود مورخین نے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ قاسم بن ربیعہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے وقت میں جوان تھے۔ نجاشی مشہور شیعہ محدث نے ان کا سال وفات ۱۳۹ھ لکھا ہے۔ حضرت سعد کی وفات اور ان کی وفات کے درمیان کم سے کم چوراسی برس کا فاصلہ ہے۔ اگر انھوں نے نوے برس کی عمر بھی پائی تھی تو پانچ چھ برس کی عمر میں حضرت سعدؓ سے ایک مخصوص قرارت جو ان کے سوا کسی صحابی کی نہ تھی سُن کو یاد رکھنے کی صلاحیت کب ہو سکتی ہے۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ حضرت سعدؓ وادی عقیق میں رہا کرتے تھے اپنے آخر زمانے میں وہیں ایک مکان بنا لیا تھا، اسی مکان میں وفات پائی لاش مدینہ میں لائی گئی اور بقیع میں مدفون ہوئے۔

اور قاسم بن ربیعہ غطفانی تھے، بنی غطفان کا بڑا مرکز تو کوفہ تھا مگر کچھ لوگ بصرہ میں بھی رہتے تھے۔ قاسم بن ربیعہ کوفے میں پیدا ہوئے ان کو پانچ چھ برس کی عمر میں وادی عقیق پہنچکر حضرت سعدؓ سے قرآن سننے کا کس طرح موقع مل سکتا ہے؟ غرض یہ روایت ہی یعلی بن عطار کی ورنہ خود ابن جریر کی من گھڑت ہے۔ اب میں ہر مسلمان سے پوچھتا ہوں کہ قرآن مجید کی متفق علیہ متواتر قرارت جس کی قطعیتِ صحت پر عہد نبوی سے لیکر اس وقت تک پونے چودہ سو برس کا ہر صحابی، ہر تابعی، ہر تبع تابعی ہر امام، ہر محدث، ہر قاری، ہر فقیہ، ہر مجتہد اور ہر مسلمان کا مسلسل و متواتر ایمانی و اقراری اجماع چلا آرہا ہے، ایسی قرارت متواترہ کے خلاف ایک خلاف عقل و درایت قرارت جو صاف اللہ کی کتاب میں تحریف کی حیثیت رکھتی ہے۔ تنہا قاسم بن ربیعہ الکوفی جیسے مدلّس سے سن کر یعلی بن عطار الطائفی تنہا روایت کرتے ہیں جو خود ننھے ننھے لوگوں سے نئی نئی حدیثیں روایت کیا کرتے ہیں جنھیں ان کے سوا کوئی روایت نہیں کرتا۔ اہل حجاز جن کو پہچانتے تک نہیں اور پھر جس کو ابن جریر جیسا شیعہ اپنی تفسیر میں درج کرتا ہے جس پر رافضیوں کی حمایت میں جھوٹی حدیثیں گھڑنے کا الزام حافظ سلیمانی جیسے شیخ المحدثین نے دیا ہے۔ اگر صرف ایسی روایت کی بنا پر قرآن مبین کے عموم نص صریح کے خلاف

تمام مفسرین وفقہار نے اجماع کرلیا تو وہ چودہ سو برس کا عہد نبوی سے لیکر ساری امت کا اس وقت تک کا اجماع کیا باطل ہو جائیگا؟ کیا قرآن مبین میں ایک لفظ کی کمی تھی جس کو ابن جریر نے یعلی بن عطار و قاسم بن ربیعہ کی مدد سے پورا کردیا؟ کیا قرآن مبین کی یہ متواتر قرأت جس کو ہونے چودہ سو برس سے آج تک ہر مسلمان پڑھتا چلا آرہا ہے، اپنے مفہوم صحیح کے ادا کرنے سے قاصر و عاجز ہے؟ معاذ اللہ من ذلک! میں اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھ کر قرآن مجید کی قرأت متواترہ کے خلاف سارے مفسرین وفقہار کے مجمع علیہ قول کو جو بر بنائے قرأت باطلہ ہے انتصاراً للقرآن المجید سرپائے حقارت سے ٹھکرا دینے کے لئے تیار ہوں، مگر قرآن مجید میں کسی طرح کی تحریف و اضافہ کو برداشت نہیں کرسکتا۔ چاہے اس کے لئے میرے سر پر آرہ ہی کیوں نہ چلا دیا جائے۔ اگر کوئی میرے ساتھ مباہلہ کرے تو میں اس کے ساتھ مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہوں کہ یہ ولہ اخ کے بعد من ام یا لام یا لامہ وغیرہ کے اضافے جو بعض صحابہ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں غلط ہیں ان صحابہؓ پر اتہام ہے اور یہ تحریف فی کتاب اللہ ہے۔ کسی صحابی کی طرف بھی اس کی نسبت صحیح نہیں۔

بھائی بہن نہیں عہدی وارث

بعض حضرات کے دل میں یہ بات کھٹکی اور وہ بھی یہ سمجھے کہ یہ من ام یا لام وغیرہ کا اضافہ یہاں پر صحیح نہیں۔ مگر پھر وہ خلش انھیں بھی پیدا ہوئی جو مفسرین کو پیدا ہوئی تھی کہ اگر عام طور سے ہر قسم کے بھائی بہن یہاں اس بارہویں آیت میں بھی مراد لیں اور پھر آخر سورہ کی ایک سو چہترویں[۱۷۶] آیت میں بھی تو پھر کہیں تو بھائی بہن کو اتنا کم دلوایا جائے اور کہیں بالکل اپنی اولاد کی طرح سب کچھ انھیں کو دلوا دیا جائے، اس کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے اس پر یہ خیال کیا کہ یہاں بھائی بہن کا حصہ ہی مذکور نہیں ہے بلکہ یہاں صرف عہدی وارث مراد ہیں جن سے میت نے عہد کیا تھا کہ تم مرو تو میں تمہارا وارث اور میں مروں تو تم میرے وارث۔ یہاں انھیں لوگوں کا حصہ معین کرکے بتایا گیا ہے۔ بھائی بہن کا ذکر صرف اسلئے آگیا ہے کہ کلالہ ان کے نزدیک بھی بے والد وبے ولد میت کو کہتے ہیں اسلئے والد و ولد کا تو یہاں خطرہ ہی نہیں، اگر بھائی بہن ہوں تو کیا بھائی بہن اس عہد و معاہدہ والے وارث کو محجوب کردینگے؟ ایسا نہیں ہے بلکہ بھائی بہن کے ہوتے بھی ان عہدی وارثوں کو اگر ایک ہو تو ایک سدس، ایک سے زیادہ ہوں تو دو سدس ملیں گے۔ غرض باوجود اس کے کہ سورۂ نسار کے اس دوسرے رکوع میں دو دو جگہ بھائی بہن کا ذکر آیا۔ پہلے گیارہویں آیت میں باپ ماں کی وراثت اور حصوں کے ضمن میں کہ وہاں بھائی بہن کی وجہ سے ماں کا حصہ گھٹ کر ایک ثلث سے ایک سدس ہو جائے گا اور باپ کو جو عصوبۃً دو ثلث یعنی چار سدس ملتے وہ بھائی بہن کی وجہ سے پانچ سدس مل جائیں گے۔ گویا بھائی بہن کا وجود صرف ماں کو نقصان اور باپ کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہے مگر خود ان کو اس کی وجہ سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ ان کو ایک حبہ بھی مل سکتا ہے۔ اسلئے کہ باپ، بھائی بہن کے لئے حاجب ہے۔ باپ کے ہوتے وہ بالکل محروم الارث ہے۔ بھائی بہن تو صرف کلالہ ہی کے وارث ہوتے ہیں۔ اور کلالہ اسی کو کہتے ہیں جس کے نہ والد ہو نہ ولد یعنی اس باب میں یہ حضرات بھی عامۂ مفسرین وفقہار کے بالکل ساتھ اور ہم خیال ہیں۔

دوسری جگہ جو بھائی بہن کے ذکر کی یہاں اس بارہویں آیت میں ہے عامۂ مفسرین وفقہار کے نزدیک تو من ام کا لفظ چھوٹا ہوا تھا جس کو ابن جریر نے حاصل کرکے مفسرین وفقہا کے حوالے کردیا۔ اس لئے یہاں بھائی بہن تو مراد ہیں مگر اخیافی۔ اور جن حضرات کی طرف

اوپر اشارہ کیا گیا ہے وہ بھی یہاں بھائی بہن کے حصے کا تذکرہ نہیں تسلیم کرتے۔ غرض قانونِ وراثت کی یہ دونوں آیتیں سورۂ نساء کے دوسرے رکوع کی یعنی گیارہویں اور بارہویں آیتیں اتریں تو ہر قسم کے وارثوں کے حصے بیان کر دیئے گئے۔ ادائے قرض و ادائے وصیت کا بھی تقسیم میراث سے پہلے کر دینے کی تاکید بار بار کی گئی۔ عام مفسرین و فقہاء کے نزدیک اخیافی بھائی بہن کے حصے بھی بیان کر دیئے گئے اور محولۂ صدر حضرات کے نزدیک تو یہاں بھی صرف ان بدنصیب بھائی بہن کا ذکر ہی فقط آ گیا ان کو کچھ دلوایا نہیں گیا ہے۔ یہاں تک کہ پورا بیان کر کے سلسلہ بیان ختم کر دیا جاتا ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ الآیہ یعنی قانونِ وراثت کی آخری حد بقول عامۂ فقہاء و مفسرین صرف اخیافی بھائی بہن کے حصوں پر اور بقول دیگر حضرات صرف عہدی وارثوں کے حصوں پر ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد ہر شخص یہی سمجھنے پر مجبور ہے کہ مذکورہ ورثاء کے سوا اور کوئی دوسرا وارث کسی میت کا عند اللہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ کئی مہینے گزر جاتے ہیں، وہ جاڑوں کا موسم جس میں سورۂ نساء کی گیارہویں بارہویں آیتیں ہی اتری تھیں وہ موسم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اب جب گرمی کا موسم آ گیا تو حسنِ اتفاق سے بعض صحابہؓ کو خیال آ گیا کہ سب کا حصہ تو بیان کیا گیا یہاں تک کہ بقول مذکورہ بالا حضرات عہدی وارثوں تک کا حصہ بیان کیا گیا دو دو بار بھائی بہن کا ذکر بھی کیا گیا مگر ان کم نصیبوں کے لئے کچھ بھی ارشاد نہ فرمایا گیا، ہر بھائی بہن کی زبان کہہ رہی ہے کہ

کیا خاک ہو شگفتہ مرا دل کہ یہ کلی　　شاید زیادہ رفتۂ فصلِ بہار ہے

تو ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کلالہ کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا گیا۔ جن کے وارث صرف بھائی بہن ہی ہوں تو فرمایا گیا کہ یستفتونك قل اللہ یفتیکم فی الکللۃ ان امرؤ ھلك لیس لہ ولد ولہ اخت الآیہ۔ لوگ تم سے پوچھتے ہیں، تو کہدو کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے کہ ایک شخص مر گیا لا ولد اور اس کے ایک بہن ہے الخ۔ لوگ پوچھتے ہیں تو بتا دو۔ یہ کہہ کر بتانا صاف بتا رہا ہے کہ اگر لوگ نہ پوچھتے تو نہ بتایا جاتا، یہ آیت آخر سورہ کی ہے اور گنتی میں ایک سو چھتر دیں آیت ہے۔ خیال تو فرمایئے، نعوذ باللہ کیا اللہ تعالیٰ بھائی بہن کا حصہ بتانا بھول گیا تھا؟ کہ لوگوں کے پوچھنے سے بتایا اتنے دنوں کے بعد آخر سورہ میں؟ اس کی وجہ نہ اگلے مفسرین نے بتائی نہ ان کے ہم خیال متاخرین نے۔ حالانکہ وما کان ربك نسیا سب پڑھتے اور رکھتے ہیں۔ پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ لوگ پوچھتے ہیں تو کہدو جس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر نہ پوچھتے تو نہ بتایا جاتا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ آیۃ الشتاء یعنی جاڑے کے موسم میں جو آیت وان کان رجل یورث کللۃ ولہ اخ الآیہ اتری تھی اس میں نہ اخیافی بھائی بہن صرف مراد ہیں نہ عہدی وارث۔ یہاں بھی عام بھائی بہن ہی مراد ہیں جس طرح آخری آیت میں عام بھائی بہن مراد ہیں۔ مفسرین و فقہاء جو آیۃ الشتاء یعنی پہلی آیت میں اخیافی، اور آیۃ الصیف یعنی آخری آیت میں عینی و علاتی مراد لیتے ہیں، یہ قرآن میں تحریف صریح ہے۔ جس کی کوئی دلیل قطعی ان کے پاس نہیں ہے۔ اور دوسرے حضرات جو اس آیۃ الشتاء یعنی پہلی بارہویں آیت میں عہدی بھائی کی وراثت ثابت کرتے ہیں اور ان کان رجل یورث کلالۃ کا ترجمہ فرماتے ہیں: "اگر کوئی مرد کسی کلالہ کا وارث بنا دیا جائے یا کوئی عورت، بحالیکہ* اس کلالہ کے کوئی بھائی یا بہن ہو تو اس مرد یا عورت میں سے ہر ایک کو ایک

---

*" بحالیکہ" کا لفظ تو بتا رہا ہے کہ ان حضرات کے قول کے مطابق عہدی وارثوں کو جبھی حصہ مل سکتا ہے کہ اس کلالہ کے بھائی یا بہن ہوں۔ اگر بھائی بہن نہ ہوں تو عہدی وارثوں کو کچھ حصہ نہیں ملے گا۔ یہاں ترجمہ میں "بحالیکہ" لکھا گیا مگر مفہوم غالباً "اگرچہ" کا، جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

ایک سدس ملے گا۔ میں نے بہت غور کیا، مگر کسی طرح سے بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ اس آیت کا یہ ترجمہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ اس کی پوری بحث میری کتاب المنقذ من الضلالہ میں تفصیل کے ساتھ ہے۔ سردست جو میرا موضوع ہے اس کی بحث اتنی تفصیل کی متحمل نہیں۔ اگر ضرورت سمجھی گئی تو بعد کو مختصر طور سے عرض کر دوں گا۔ مفصل طور سے تو اصل کتاب میں موجود ہی ہے۔ گو کتاب قلمی ہے، چھپی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چھپوا دے۔

اس کے بعد میں بخیال اختصار چند باتیں نمبروار درج کرتا ہوں، ان نمبروں سے حقیقت امر پر صاف روشنی پڑ جائیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

(۱) وان کان رجل یورث کللۃ الآیۃ۔ اس جملے کا عطف فان لم یکن لہ ولد وورثہ ابوہ کے سوا اور کسی جملۂ سابقہ پر نہیں ہو سکتا جس کے وجوہ و دلائل کتاب المنقذ من الضلالہ میں بالتصریح مذکور ہیں۔

(۲) یورث مجرد ہے۔ باب افعال سے نہیں ہے۔ اور رجل کی صفت ہے۔ رجل یورث موصوف وصفت مل کر کان کا اسم ہے، اور کللۃ، خبر۔ جملے کا ترجمۂ صحیحہ یوں ہے "جو شخص موروث ہو رہا ہے اگر کلالہ ہو۔" غیر وارث اگر وارث بنایا جائے تو اس کیلئے باب تفعیل ہے افعال نہیں۔

(۳) یورث فعل مجہول ہے، اس لئے اس کی نسبت مفعول کی طرف ضرور ہے، مگر آخر اس کا کوئی نہ کوئی فاعل تو ضرور ہوگا۔ پھر یہاں وہ فاعل کون ہو سکتا ہے؟ اس کو ڈھونڈئیے جملہ معطوف علیہا میں۔ جملہ معطوف علیہا میں ہے وَرِثَہٗ اَبَوٰہُ۔ یہاں سے معلوم ہو گیا کہ رجل یورث میں یورث کے فاعل اَبَوان ہیں۔ یعنی وہ میت لاولد مرد جس کے وارث اس کے اَبَوان ہو رہے ہیں، یا اپنے ابوان کا جو موروث ہو رہا ہے، اگر کلالہ ہو۔

(۴) کلالہ کس کو کہتے ہیں سورۂ نساء کی آخری آیت میں خود بتا دیا ہے: قل اللہ یفتیکم فی الکللۃ، ان امرؤٌ ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت (او اخ او کلاھما) یعنی جس میت لاولد کے وارث بھائی بہن ہوں وہی کلالہ ہے۔ کلالہ کے مفہوم میں صرف دو شرطیں ہیں ایک تو لاولد ہونا، دوسری شرط بھائی بہن کا ہونا لاوالد ہونا شرط نہیں۔ ہو یا نہ ہو۔

(۵) کلالۂ تام، یا کامل وہ ہے جس کے وارث نسبی صرف بھائی بہن ہوں اور کوئی نہ ہو۔ اور کلالہ ناقص وہ ہے جو کسی وارث کے مقابلے میں کلالہ ہو کسی وارث کے مقابلے میں کلالہ نہ ہو۔

(۶) کلالہ کا لفظ وارث کیلئے بھی آتا ہے، موروث کیلئے بھی آتا ہے، اور وراثت کیلئے بھی آتا ہے۔ بھائی بہن وارث کلالہ ہیں جس میت کے وارث بھائی بہن ہوں وہ میت موروث کلالہ ہے۔ اور بھائی بہن کی وراثت، وراثت کلالہ ہے۔

(۷) والدین کے ہوتے اگر بھائی بہن بھی ہوں تو میت صرف بھائی بہن کے مقابل کلالہ ہے۔ یعنی کلالۂ موروث بھائی بہن کیلئے ہے اور وہ بھائی بہن کلالہ ہوں گے اور ان کی وراثت کلالہ ہوگی۔ والدین کے مقابل وہ میت کلالہ نہ ہوگا۔ نہ والدین کلالۂ وارث ہوں گے نہ والدین کی وراثت کلالہ ہوگی۔ اسی لئے میں نے ایسے میت لاولد کو جس کے والدین بھی ہوں اور بھائی بہن بھی کلالہ ناقص قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ موروث اپنے بعض وارثوں کے مقابل تو کلالہ ہے اور بعض وارثوں کے مقابل کلالہ نہیں ہے۔

ہاں اگر والدین بھی نہ ہوں، صرف بھائی بہن ہی ہوں تو ایسا موروث مستقل طور سے کلالہ کامل ہے۔ اسی لئے قرآن مبین میں جہاں والدین کے ہوتے بھائی بہن وارث ہوتے ہوں وہاں یہ طریقۂ بیان اختیار فرمایا کہ وان کان رجل یورث کلٰلۃ یعنی اور اگر وہ شخص جو والدین کا موروث ہو رہا ہے کلالہ ہو۔ یعنی ولد اخ او اخت اور اس کے بھائی یا بہن بھی ہوں۔ اور جہاں مستقل کلالہ یعنی کلالہ کامل کا ذکر ہے۔ یعنی جو خود بمعنٰی موروث کلالہ، جس کے کل وارث، وارث کلالہ اور جس کی وراثت بالکل وراثتِ کلالہ ہے، ہر حیثیت سے وہ کلالہ ہی کلالہ ہے۔ اس کو مستقل کلالہ کی حیثیت سے ذکر کیا۔

حال و تمیز کی ترکیب

اسی بنا پر بعض علمائے نحو نے رجبؐ کو کان کا اسم، یورث کو اس کی خبر اور کلٰلۃ کو یورث کی ضمیر کا حال یا تمیز قرار دی ہے۔ جس کی وجہ سے ترجمہ یوں ہوگا "اور اگر کوئی مرد موروث ہو رہا ہو درآنحالیکہ وہ کلالہ ہو۔ یا کلالہ کی حیثیت سے"۔۔۔۔ حال کی ترکیب سے تمیز کی ترکیب زیادہ واضح ہے۔ مغنی اللبیب جلد دوم ص۲۱۷ مع شرح دسوقی میں اس پر بحث کی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ حال کہئے تو مطلب یہ ہوگا کہ کوئی شخص موروث ہو بحالت کلالگی یعنی وہ کلالۂ مستقل نہ ہو مگر کسی وقت کلالہ بن گیا ہو۔ اسی طرح تمیز کی صورت میں بھی مطلب یہ ہوگا کہ کوئی شخص کسی وارث کے مقابل کلالہ کی حیثیت سے موروث ہو۔ یعنی کلالۂ مستقل نہ ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کا صحیح تعلق اوپر سے معلوم نہ کر لینے کی وجہ سے نحویوں کو حال یا تمیز کا شبہ ہوا ورنہ رجل موصوف یورث صفت، موصوف و صفت مل کر کان کا اسم ہوا اور کلٰلۃ خبر۔ بس یہی اور صرف یہی ترکیب صحیح ہے۔ اس کے سوا کھینچ تان کے سوا کچھ نہیں۔ اگرچہ حال و تمیز کی ترکیب سے بھی میرے مفہوم کی تائید ہو رہی ہے۔ مگر میں غلط تائید بھی پسند نہیں کرتا۔

(۸) مذکورہ بالا سات نمبروں سے یہ واضح ہو گیا کہ کلٰلۃ اسی لاولد مردے کو کہتے ہیں جس کے بھائی بہن ہوں۔ اگر بھائی بہن بھی نہ ہوں تو باپ کے ورنہ دادا کے۔ یا ماں کے یا نانا کے بھائی بہن ہوں۔ غرض یہ کہ اپنی اولاد نہ ہو تو اس میت کے قریب تر اصول میں سے کسی کی اولاد وارث ہو بوجہ اصلیں کے اقرب ہونے کے۔ تو وہی کلالۂ کامل ہے۔ جدی اقربین کو مادری اقربین پر ترجیح ہوگی، مگر والدین کے ہوتے میت کے بھائی بہن کے سوا اور کسی کے بھائی بہن کو وراثت کا حق نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ والدین کے ہوتے والدین کے یا والدین کے والدین کے بھائی بہن بعید تر ہونے کی وجہ سے ضرور محروم ہو جائیں گے اور والدین ان کے حاجب ٹھہریں گے۔

(۹) اصل توریث جو قرآن ہی سے مستنبط ہے حسب ذیل ہے:۔

اصل وارث میت کی اولاد ہے جن میں مرد کو فوقیت ہے۔ اگر صرف مرد ہو تو کل مال اسی کا ہے۔ صرف ایک عورت یعنی بیٹی ہو تو نصف مال اس کا ہے۔ ایک سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو دو ثلث مال ان کو ملے گا۔ بیٹا بیٹی دونوں ہوں تو للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق بیٹی کو ایک حصہ اور بیٹے کو دو حصے۔

اولاد کے ہوتے والدین بھی ہوں تو ہر ایک کو ایک سدس دینے کے بعد باقی مال اولاد پر تقسیم ہوگا۔ اس وقت باپ ماں برابر کے شریک ہیں، موزون ہونے کی وجہ سے ان کے حصے میں کمی بیشی نہ ہوگی۔ اسلئے کہ ماں کا حق بھی اولاد پر باپ سے کم نہیں ہے۔ باپ درجے میں افضل ہے مگر حقوق ماں کے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ حملتہ امہ کرھا و وضعتہ کرھا وحملہ وفصالہ ثلثون شھرا۔ اس (بچے) کو اس کی ماں نے

تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف سے جنا۔ اور اس کے آغاز حمل سے دودھ بڑھائی تک تیس مہینے ہوتے ہیں (سورۂ احقاف ج ۲۶ رکوع ۲) یہ زحمتیں باپ نے اولاد کے لئے کہاں کھینچیں اسلئے اللہ کی رحمت نے یہ گوارا نہ کیا کہ ماں کو سدس سے بھی کم یعنی اس کا نصف بارہواں حصہ باپ کے مقابل ملے۔ اور نہ یہ مناسب تھا کہ باپ کو دو سدس دلوا دیا جائے۔ ایسا کیا جاتا تو ڈیڑھ ثلث یعنی نصف مال والدین کو ملتا اور نصف ہی ڈیڑھ ثلث اولاد کیلئے بچتا۔ اولاد جو فطرۃً وراثت کیلئے پیدا ہی کئے گئے ہیں ان کا حصہ دوسروں سے کم نہیں ہونا چاہیئے۔ اولاد کا تو تعدد بھی ہوتا ہے اور والدین میں کسی کا بھی تعدد ممکن ہی نہیں۔ والدین سے میت کا مال پھر میت کی اولاد کے عوض زیادہ امید ہے کہ بھائی بہن تک منتقل ہو جائے۔

یہیں سے یہ مسئلہ بھی مستنبط ہو گیا کہ ورثاء کے ہوتے غیر وارث کے لئے وصیت ثلث مال سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے[1]۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ہوتے دوسرے ورثاء کو ثلث سے زیادہ نہیں دلوایا۔ شوہر کو ربع اور بیوی کو اولاد کے ہوتے ثمن ہی دلوایا۔ باپ ماں کو ربع اور ثمن کا درمیانی حصہ یعنی سدس دلوایا۔ باپ ماں دونوں ہوں تو دو سدس یعنی ایک ثلث مال کا نکل جائیگا اور اولاد کیلئے صرف دو ثلث رہ جاتے ہیں اسلئے ورثاء کے ہوتے غیر وارث کے لئے یا صدقہ و خیرات وغیرہ کیلئے کوئی وصیت کرے تو اس کو ثلث مال سے زیادہ کی وصیت نہیں کرنی چاہیئے۔ رسول اللہ صلعم کا کوئی دینی حکم ایسا نہیں ہو سکتا جو قرآن سے مستنبط نہ ہو۔

اور اگر اولاد نہ ہو تو والدین اولاد کے قائم مقام ہو جاتے ہیں۔ ایک ثلث ماں کو دلوا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد باپ کے حصے کی تعیین کی ضرورت نہ تھی، باقی دو ثلث اب باپ کے سوا کون لے گا؟ اور ہے کون؟ ہاں اگر لاولد میت کے والدین کے ساتھ میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو جو پوزیشن اولاد کے ساتھ والدین کا تھا، وہی پوزیشن والدین کے ساتھ میت کے بھائی بہن کا ہو جائیگا یعنی جس طرح اولاد کے ساتھ باپ ماں میں سے ہر ایک بلا تفریق مرد و زن ایک ایک سدس پاتا تھا۔ بالکل اسی طرح باپ ماں کے ساتھ بھائی بہن بلا تفریق مرد و زن ایک ایک سدس پائیں گے۔ یہ بھائی بہن وارث کلالہ ہوں گے، ان کی وراثت بھی وراثت کلالہ ہوگی۔ اور وہ میت لاولد بھائی بہن کے مقابل مورث کلالہ یا موروث کلالہ کہا جائے گا۔

اور اگر والدین بھی نہ ہوں، میت لا ولد و لا والد ہو، تو پھر بھائی بہن ہی اولاد کی جگہ لے لیں گے، اور بالکل اولاد ہی کی طرح بھائی بہن کو حصے للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق ملیں گے۔ اگر صرف ایک بہن ہو تو صرف ایک بیٹی کی طرح اس کو نصف مال ملے گا ایک سے زیادہ بہنیں ہوں تو ایک سے زیادہ بیٹیوں کی طرح دو ثلث ان کو ملے گا۔ صرف بھائی ہی ہوں تو صرف بیٹے جس طرح کل مال لے لیتے اسی طرح اس وقت سارا مال وہی بھائی ہی لے لیں گے۔ یہ اصول اتنا واضح تھا جو غور کرنے سے سمجھا جا سکتا تھا۔ اور اہل علم صحابہؓ سمجھ رہے تھے۔ مگر جب چند مہینوں کے بعد بعض سطحی عقل والوں نے کلالۂ کامل یعنی جس میت کے نہ اولاد ہو نہ والدین اور بھائی بہن ہی

---

[1] سوال یہ نہیں کہ کیا ہونا چاہیئے اور کیا نہیں ہونا چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن میں اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ اور بس۔ قرآن نے وصیت کو کہیں مشروط نہیں کیا۔ اسلئے ایسے غیر مشروط بیّن حکم کو اس طرح مقید و مشروط کر دینے کی اجازت کسی انسان کو نہیں مل سکتی۔ اسی لئے ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی روایت رسول اللہ کی نہیں ہو سکتی جس میں دین پر اس طرح اضافہ کیا گیا ہو۔ (طلوع اسلام)

صرف ہوں تو بھائی بہن کو کیا ملے گا۔ یہ سوال کر دیا اور جب سوال پیش کر دیا تو جو صحابہ سمجھ رہے تھے وہ بھی خوش ہو گئے کہ اب کچھ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب پوچھا گیا ہے تو پھر جواب آ ہی جائیگا۔ اسی لئے پہلے طنزیہ انداز میں فرمایا گیا کہ یستفتونك لوگ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ اس کے بعد یہ فرماکر کہ جب پوچھتے ہی ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیدیتا ہے۔ یہاں صرف "کلالہ" عام طور سے اس طرح فرمایا گیا ہے کہ کلالۂ موروث، کلالۂ وارث اور وراثت کلالہ سب کو شامل ہو۔ مگر کلالہ ہے کون؟ کس کو کلالہ کہتے ہیں اس کو بھی بتادیا ان امرؤ هلك ليس له ولد وله اخت (واخ يرثها او امرأة كذلك) کہ ایک مرد یا عورت لاولد مرجائے اور اس کے بھائی یا بہن یا دونوں ہوں (خلاصۂ مفہوم آیت) آگے جو صورت بیان فرمائی گئی ہے وہ کلالۂ کامل کی یعنی جس کے وارث صرف بھائی بہن ہی ہیں۔ والدین میں سے کوئی بھی نہیں۔ مگر لیس لہ ولد کے ساتھ ولا والد نہیں فرمایا گیا۔ اسی لئے کہ کلالہ کیلئے لاوالدیت بھی لاولدیت کی طرح لازمی شرط نہ سمجھ لی جائے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جہاں کلالۂ کامل یعنی لاولد ولاوالدہی کا ذکر ہو وہاں بھی صرف لیس لہ ولد کہہ کر رک جانا اور ولا والد نہ کہنا بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔ ابن جریر کا ذہن ادھر طرف نہ گیا ورنہ ایک قرارت یہاں بھی ولا والد کی حضرت سعدؓ نہیں تو حضرت ابی بن کعب یا حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہما میں سے کسی کی طرف ضرور منسوب کردیتے۔ راویوں کا سلسلہ جوڑ دینا تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مختصر یہ ہے کہ یہاں ولا والد کا مفہوم موجود رہتے ہوئے کلالہ کے معنی بتانے میں ولا والد کا لفظ نہ کہنا اور صرف عنوان بیان سے ولا والد کا مفہوم ادا کردینا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ ولا والد ہونا کلالہ کی تعریف میں شرط لازمی نہیں ہے۔

(۱۰) کلالہ کے معنی چونکہ مفسرین نے غلط روایتوں کی بنا پر من لا والد لہ ولا ولد مان لیا ہے اور اسکی وجہ سے باپ کو بھائی بہن کا حاجب بھی ان کو ماننا پڑا۔ تو اس کے بعد جب شرائط حجب بنانے لگے تو پہلے ادلاء کی شرط لازمی بنائی کہ باپ مدلیٰ بہ ہے اور بھائی بہن مدلی۔ پھر وہ سب دشواریاں پیش آ گئیں جن کا ذکر اوپر گذر چکا۔ جیسے جیسے دشواریاں پیش آتی گئیں قیدیں بڑھاتے گئے۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو دوسری اصل حجب کیلئے بنائی۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو مولانا عبدالحی نے مجبور ہو کر فرمایا کہ دو ہی صورتیں تو تھیں جو دونوں ناکام رہیں اب کوئی تیسری صورت اگر ہے فیجب ان یبین تو" واجب ہے کہ بیان کی جائے"۔ دیکھئے اس واجب کو کون ادا کرتا ہے۔

پس اس بھائی بہن کے لپیٹ میں بیچارے یتیم پوتے بھی آ گئے۔ ورنہ خاص طور سے یتیموں کو محروم کرنا فقہاء کو مقصود نہ تھا مگر ان کی خطائے اجتہادی کا تیر ایسا چلا جس سے بھائی بہن ہی اپنے مرحوم بھائی کے ترکہ سے باپ کی وجہ سے محروم نہ ہوئے بلکہ غریب یتیم پوتا بھی اپنے دادا کے ترکہ سے اپنے چچا کی وجہ سے محروم ہو گیا۔ فقہاء نے ایک تیر سے کتنے کلیجے چھلنی کر کے رکھدیئے۔

رکھدیا چھید کے دل، کیا یہ خطا تھوڑی ہے؟ بے خطا کہنے کو صرف نشانہ تیرا

تلك عشرة كاملة پہلے کی تصریحات اور پھر ان دس نمبروں سے مسئلہ حجب جو فقہاء کا متفق علیہ مسئلہ ہے اس پر کافی روشنی پڑجاتی ہے۔ یہ پوری بحث فقہاء کے متفق علیہ اصول کو ایک حد تک مانتے ہوئے انہیں حدود کے اندر کی گئی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد قانون حجب پر صرف قرآنی تصریحات کے ماتحت روشنی ڈالوں گا مگر علمائے وقت کے خیالات ان معروضات کے متعلق تو ذرا معلوم ہو لیں۔

ایک گذارش: جو بزرگ اس مضمون پر موافقت یا مخالفت میں قلم اٹھائیں اور جس پرچے میں وہ مضمون چھپے اس کی ایک کاپی میرے پاس بھی ضرور بھیجکر مجھے اس سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔ والسلام

(تمنا عمادی مجیبی غفرلہ)

۲۳ عبدالعزیز لین۔ نواب گنج۔ ڈاکخانہ پیل خانہ۔ ڈھاکہ

قانونِ حجب

(علامہ اسلم صاحب جیراجپوری)

جولائی کے رسالہ طلوعِ اسلام میں مولانا تمنا صاحب، کا مضمون عنوان بالا سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے اگرچہ میرا نام نہیں لیا ہے مگر اعتراضات میرے ہی اوپر کئے ہیں۔ میں نے سورۂ نسار کی آیت ۱۲ ــــ وَاِنْ کَانَ رَجلٌ یُّوْرَثُ کلٰلۃ الآیہ ــــ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فقہ فرائض میں اس آیت سے جو اخیافی بھائی بہن کو ذوی الفرض قرار دیا گیا ہے صحیح نہیں ہے بلکہ اس میں عہدی وارثوں کے حصے بیان کئے گئے ہیں جن کا ذکر اسی سورہ کی آیت ۳۳ میں ہے۔

والذین عقدت ایمانکم فآتوھم نصیبہم

جن سے تمہارا عہد ہو گیا ہو ان کو ان کے حصے دو

مولانا تمنا نے یہاں تک تو مجھ سے اتفاق کیا ہے کہ اس میں اخیافی بھائی بہن کے حصے جو فقہا نے قرار دیئے ہیں صحیح نہیں ہیں مگر اس سے اختلاف کرتے ہیں کہ یہ عہدی ورثہ کے حصے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ باپ ماں کی موجودگی میں یہ مطلق بھائی بہن کے حصے ہیں مگر دلیل اس پر سوائے اپنے قیاس کے اور کچھ نہیں دیتے۔ میرے اور ان کے درمیان متنازع فیہ صورت یہ ہے:

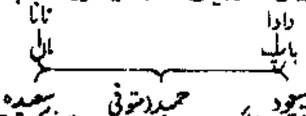

حمید نے وفات پائی۔ باپ کو چھوڑا اور دادا کو۔ ماں کو چھوڑا اور نانی کو۔ اور اپنے باپ ماں کی ایک بیٹی سعیدہ اور ایک بیٹے مسعود کو چھوڑا جو اس کے حقیقی بہن بھائی ہیں۔ مولانا تمنا باپ کو دادا کا حاجب قرار دیتے ہیں اور ماں کو نانی کا یعنی باپ کی موجودگی کی وجہ سے دادا کو وراثت نہیں ملے گی اور ماں کی موجودگی کی وجہ سے نانی کو۔ مگر یہی باپ اور ماں ان کے نزدیک اپنی بیٹی سعیدہ اور بیٹے مسعود کے حاجب نہیں ہو سکتے۔ مولانا ان کو حصہ دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اس لئے یہاں ان سے چند سوالات کرنے ضروری ہیں۔

(۱) آپ باپ ماں کی موجودگی میں بھائی بہن کو کس قرآنی دلیل سے حصے دیتے ہیں؟

(مولانا موصوف نے دراصل یہاں قیاس سے کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں "باپ ماں کی موجودگی میں بھائی اور بہن ماں کا حصہ ⅓ سے ⅙ کر دیتے ہیں مگر ان کو خود اس سے کوئی فائدہ نہیں ورنہ ان کو ایک حبہ مل سکتا ہے۔ اس لئے مولانا صاحب نے رحم کھا کر ان کے بھی حصے مقرر فرما دیئے۔ لیکن یہ نہ سوچا کہ بلا قرآنی سند کے یہ حصے دیئے کیسے جائیں گے۔)

(۲) سورۂ نساء کی آخری آیت میں بھائی بہن کے حصے اولاد کی طرح (نر کو مادہ سے دگنا) رکھے گئے ہیں مگر اس بارہویں آیت میں تو مذکر اور مونث کے حصے مساوی ہیں۔ اگر بقول مولانا تمنا صاحب یہاں بھی بھائی اور بہن ہی کے حصے ہیں تو تقسیم میں فرق کیوں ہے؟

(۳) قرآن نے پورے قانون وراثت کو صرف پانچ آیتوں میں بیان فرمادیا ہے۔ ان میں کلالہ کا لفظ دو جگہ آیا ہے۔ آپ نے کس دلیل سے ایک جگہ کلالہ ناقص اور دوسری جگہ کلالہ کامل مراد لیا ہے۔ ایسے نازک اور مختصر قانون سازی کے موقع پر ایک ہی لفظ کے دو معانی کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ خیال رکھئے کہ آپ کا قیاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۴) آیت ۳۳ میں آپ نے عقدت ایمانکم کا ترجمہ عقد نکاح کیا ہے۔ یہ ثبوت طلب ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ بارہویں آیت میں میاں اور بیوی کے حصے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں۔ پھر آیت ۳۳ میں پہنچکر یہ فرمانا کہ جن سے تم نے عقد نکاح باندھا ہے ان کو ان کے حصے دیدو کیا معنی رکھتا ہے۔ میرے خیال میں مولانا صاحب اس آیت سے بھی سرسری گزر گئے ہیں انھوں نے یہ سوچا نہیں کہ یہ کس ضرورت سے یہاں لائی گئی اور کیا فائدہ دیتی ہے جو اس سے پہلے ہم کو حاصل نہیں تھا۔

(۵) آپ نے فرمایا ہے کہ غیر وارث اگر وارث بنایا جائے تو اس کیلئے باب افعال نہیں بلکہ باب تفعیل ہے۔ اس پر کوئی سند نہیں دی۔ نہ قرآن کی کوئی آیت پیش کی جس میں یہ لفظ باب تفعیل سے لایا گیا ہو۔ بخلاف اس کے متعدد آیات میں اس کا استعمال باب افعال ہی سے ہوا ہے۔ مثلاً سورہ شعراء میں ہے اورثناها بنی اسرائیل۔ سورۂ احزاب میں ہے واورثکم ارضهم و دیارهم۔ سورۂ فاطر میں ہے ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

دراصل یہ خود ساختہ قاعدہ مولانا نے اپنی غلطی کی حمایت کیلئے وضع فرمایا ہے مگر یہ نہ صرف عربی زبان بلکہ قرآن پر ظلم ہے۔

ان سب غلطیوں کی وجہ یہ ہے کہ مولانا تمنا نے قرآنی وراثت سمجھنے میں جو پہلا قدم رکھا وہی غلط رکھا۔ قرآن نے نسبی رشتہ داروں کی وراثت کا سب سے پہلا بنیادی قاعدہ جو بتایا ہے وہ یہ ہے: للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون۔ وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون ـــــ مردوں کو حصہ ملے گا اس مال میں سے جو ان کے باپ ماں یا کسی اقرب نے چھوڑا ہے اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس مال میں سے جو ان کے باپ ماں یا کسی اقرب نے چھوڑا ہے۔ یعنی نسبی رشتہ دار باپ۔ ماں اور اقرب کے سوا اور کسی کے ترکہ سے حصہ نہیں پاتا۔ اقرب کا مفہوم میں نے اپنے رسالہ محجوب الارث میں جو اس سے پہلے طلوع اسلام میں چھپ چکا ہے واضح کر دیا ہے کہ مورث اقرب اس کا ہوگا جس سے بلا واسطہ اس کا رشتہ ہے اور اگر بواسطہ ہے تو بروقت مورث کی وفات کے وہ واسطہ مفقود ہو۔ میں نے دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ اس کے سوا اقرب کا کوئی دوسرا مفہوم ہو نہیں سکتا۔

اب صورت متنازع فیہ کو ملاحظہ فرمائیے۔ حمید متوفی سعیدہ اور مسعود کا نہ باپ ہے نہ ماں، نہ اقرب ہے۔ کیونکہ اس کا رشتہ ان دونوں بھائی بہن کے ساتھ بذریعہ باپ اور ماں کے ہے جو دونوں موجود ہیں۔ پھر وہ دونوں حمید کے ترکہ سے حصہ کیسے پا سکتے ہیں؟ مولانا نے یہ پہلا قدم غلط رکھا اس لئے اس کے بعد جتنے قدم رکھے سب غلط در غلط ہوتے گئے۔